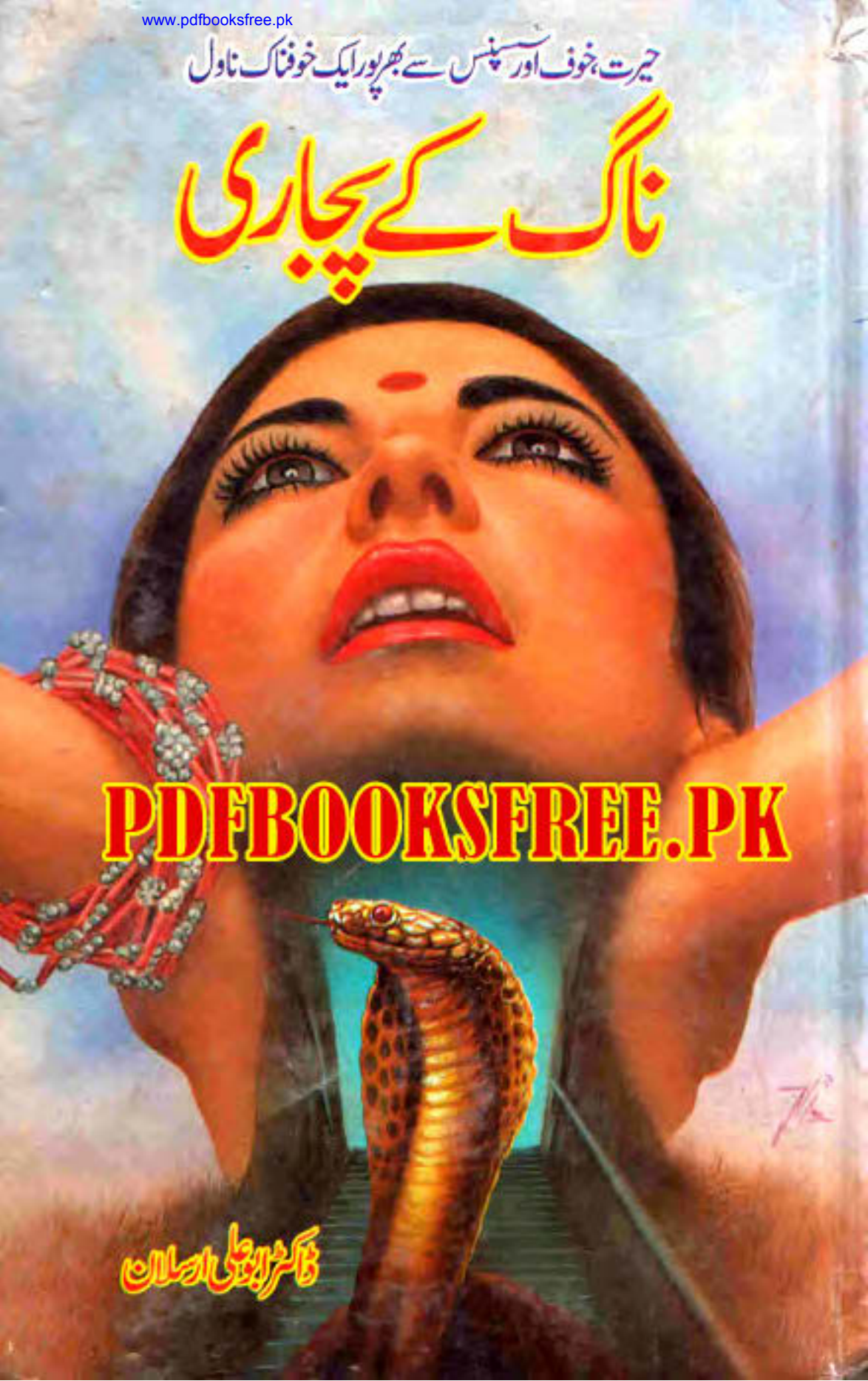


حیرت، خوف اور سہنس سے بھرپور ایک خوفناک ناول

# ناگ کے پجاری

**PDFBOOKSFREE.PK**

ڈاکٹر وحید علی ارسلان



## ناگ کے پجاری

جیسا کہ نادل کے نام سے ظاہر ہے، یہ ایک ایسے قبیلے کی داستان ہے جو ناگ دیوتا کی پوجا کرتا تھا۔ جنگلوں میں رہنے والے ہم شر کے باسیوں کی طرح ایک ایک بات کے چار چار معنی سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کے لئے دن کا مطلب دن اور رات کا مطلب رات ہوتا ہے۔ وہ تیز روشنی کو دن کا متبادل قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کا ایک اور سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں، ان کے ذہن میں، ان کے جذبوں میں کھوٹ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ یہ شے صرف ہم شریوں کے لئے بنی ہے بلکہ ہم نے اپنے لئے خود بنائی ہے۔

یہ کہانی ہے ایک معصوم جنگلی دو شیرہ کی، جس نے ایک شہری بابو سے پیار کیا اور اس پر جی جان سے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا۔

یہ قصہ ہے ایک شہری بھنورے کا، جو اس جنگلی پھول کا رس پی کر اڑ گیا۔ یہی نہیں، جاتے جاتے اس نے اس پھول کی پتیاں اس درندگی سے نوج ڈالیں کہ وفا کے دامن میں آگ لگ گئی۔

یہ داستان ہے ایک وفا کے پجاری کی، جس نے اپنے من مندر میں کسی کی محبت کا دیا جلایا اور اس کی لو پر، پروانہ وار نثار ہو گیا۔

اور --- یہ احوال ہے اس انتقام کا، جس کا شعلہ ایک ایسے دل کے چلتے خرمن سے اٹھا جس میں کبھی صرف پیار ہی پیار تھا، وفا ہی وفا تھی، ایثار ہی ایثار تھا۔ اس میں آپ کو ایک ایسا اندھا ہوس کا پجاری باپ بھی ملے گا جسے رنگ رلیوں کے اندھیرے میں اپنی بیٹی کا وجود بھی بے لباس دکھائی دیتا ہے۔



”خدا کے لئے مجھے گھر سے نہ نکالو باپو۔ مجھے گھر سے نہ نکالو۔ مجھے محاف کر دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہاری نوکرائی بن کر رہوں گی۔“ وہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور مغبوطی سے اس کے گھٹنے تھام لے۔

”نکل جا میرے گھر سے۔ ذلیل عورت۔“ اس نے اسے باہر دھکا دے دیا اور دروازہ بند کر کے شراب کے نشے میں لاکھڑا ہوا دھڑام سے بستر پر آگرا۔

باہر خونِ محمد کر دینے والی سردی میں شامی، اس کی بے خطا پیوی، پچنے پکڑوں میں اپنے جسم کو سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی۔ اس کی جگر خراش فریاد سے پتھر دل انسان کا دل بھی موم ہو جاتا لیکن شوکت پر اس کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہ ہوا۔

پھر اس کی آواز بند ہو گئی۔ سرد ہوائیں اس کے نرم و نازک جسم کو سویں کی طرح چمیدتی رہیں۔

شوکت نرم و گداز بستر پر گرم کمرے میں بڑے آرام سے سوتا رہا اور باہر شامی ساری رات سردی میں لڑتی رہی۔ اس کا جسم ٹپلا پڑ گیا۔ خون اس کی رگوں میں نچنے لگا مگر وہ اس حالت میں بھی اپنے مجازی خدا کو پکارتی رہی اور آخر کار بیوشی کی انتہا ممرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

بیوش ہوئے سے پہلے بھی اس کے ہونٹوں پر ایک ہی پکار تھی۔ ”باپو۔ دروازہ کھول دو۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں تمہاری عزت ہوں۔۔۔ مجھے یوں بے عزت نہ کرو۔“



تین سال قبل۔۔۔

شکار کے دوران ایک رات شوکت جنگل میں اپنے ساتھیوں سے بھڑک پیروں کی ایک بستی میں جا نکلا۔ بستی گھاس چھوٹوں کے جھونپڑوں پر مشتمل تھی اور

زندگی کے ایسے عجیب و غریب گوشوں اور اسرار و تجرک کی ایسی چھینی ہوئی وادیوں کا سفر اس ناول میں آپ کو دم بخود کر دے گا جن کے بارے میں آپ نے سنا تو ہو گا، کبھی دیکھا نہ ہو گا۔ آپ خود کو اس سفر میں ایک مسافر نہ سمجھیں، تو تمہارا ذمہ۔

ڈاکٹر ابو علی ارسلان ایک کسٹ مشین اویسب ہیں۔ وہ طب کی دنیا کے ساتھ ساتھ اقلیمِ قلم کے بھی بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد آپ ان کا ادبی قد کچھ اور بلند محسوس کریں گے، انشاء اللہ۔

زاہد حسن

شٹا کسٹ :

مکتبہ قابل۔ اردو بازار لاہور

کتب خانہ مقبول عام۔ فیصل آباد

وحید بیک ڈپو۔ ڈونگہ بونگہ

Ph : (0691)-560176-560076

ہستی سے ہا ہر جشن منایا جا رہا تھا۔ سیرے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے یہ سب دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظریاتیک طرف اٹھی اور وہیں جم گئی۔ کئی لڑکیوں کے محرمات میں ایک لڑکی شہزادیوں کی سی شان کے ساتھ براجمان تھی۔ وہ اس کے حسن کی بھیلوں میں خود کو جلا بیٹھا۔ بھرا بھرا جسم، گندمی رنگ، گول چہرہ، کنوڑا نین، سرودتہ اور جسم پر صرف ایک لمبی سی کمال، جس سے اس نے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ ایک تک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر شادی نے بھی اس کی نظروں کی گرنی کو محسوس کر لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جشن ختم ہو گیا۔ شادی نے آخری مرتبہ اوائے قاتلانہ سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی سیہیلوں کے ساتھ چلی گئی۔

”باؤ! کون ہو تم اور یہاں کیسے آئے ہو؟“ وہ ایک آواز سن کر چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہستی کا سردار اس کے قریب کھڑا تھا۔

”میں۔۔۔ میں راستہ بھول کر یہاں آ گیا ہوں۔“ تب سردار نے اسے رات گزارنے کی دعوت دی جسے اس نے خوشی سے قبول کر لیا۔ اس نے وہ رات وہاں گزار دی اور صبح وہ ندی پر شادی سے ملا۔

پہلی ہی نظر کا تیردو دنوں کے دنوں کو گھما ل کر چکا تھا۔ وہ اکٹھے ہستی میں واپس آ گئے اور سردار کے پاس پہنچ کر شوکت اور شادی نے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران وہ ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھتے رہے۔ سردار نے ان کی چوری پکڑ لی۔ سردار نے شادی سے باپ کے بارے میں پوچھا تو وہ شہزادہ بھاگ گئی۔ بوڑھے سردار کے لیوں پر ایک شفیق مسکراہٹ بھیل گئی۔ اس نے ان دونوں کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔

شوکت اس دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ ماں باپ لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر ملک عدم کو سدھار چکے تھے۔ رشتے داروں کو وہ خود نہ ملتا تھا۔ کپڑے کی مل کا مالک تھا۔ کوڑوں کا کاروبار تھا۔

شادی نے اسے بتایا کہ سردار اس پر ایک عمل کرنے والا ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک ایسے بچے کی ماں بنے گی جو اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچ کر اگر لڑکا ہو گا تو ناگ اور لڑکی ہوگی تو ناگ بن جائے گی طاقت کے مالک ہوگی اور اگر وہ خود بچے کی

پیدائش کے بعد صحیح سلامت رہی تو جس وقت چاہے گی، ناگن کا روپ دھار سکے گی لیکن اس کا بچہ صرف مخصوص دنوں میں ہی یعنی جب چاند پورا ہو گا اپنی کاپی کاپ کر سکے گا۔

شوکت نے اس کی اس بات کی سختی سے مخالفت کی اور سردار نے خود بھی اس عمل کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر جب شوکت حسب وعدہ شہر سے واپس لوٹا تو شادی اس کی دلہن بن گئی۔ اس نے شہر سے دور لیکن شادی کی ہستی سے چند میل کے فاصلے پر ایک پر فضا مقام پر بنگہ بنوایا اور دونوں محبت کی باتوں میں بائیس ڈالے زندگی کا سفر طے کرنے لگے۔

شوکت نے شادی کو شہر کے ماحول سے بہت حد تک آشنا کر دیا تھا۔ پڑھنے لکھنے اور ہوٹلنگ کے ساتھ ساتھ شوکت نے اسے اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کی تربیت کے لئے باقاعدہ لیزڈ ٹیوٹر رکھ دی تھی۔ شادی بہت جلد اس کے شانہ بشانہ اونچے طبقے میں موو کرنے لگی تھی۔ وہ شہری ادب آداب اور تہذیب کو سمجھتی تھی۔ اس میں جذبہ ہونے کی کوشش کرتی تھی مگر فطری شرم و حیا اسے ایک خاص حد سے آگے نہ جانے دیتے تھے۔

دو ممال گزر گئے۔ شوکت بے اولاد ہی رہا۔ اب وہ شادی سے بیزار رہنے لگا تھا۔ شادی اس کے بدلنے پر دیر سے برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اپنی سی کوشش کی مگر شوکت تو بھنورا تھا۔ وہ اس پر تکیہ کر کے کب تک بیٹھا رہتا۔ شادی پچکے پچکے ردیا کرتی۔ وہ شوکت سے بے تحاشا محبت کرتی تھی لیکن جب شوکت اس سے سمجھنے لگا تو وہ ترپ گئی۔ اس نے شوکت کا دل جیتنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سب فضول

شوکت دن بدن شادی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ شہر کے بدنام علاقے میں جانے لگا تھا۔ رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتا اور جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو شراب کے نشے میں لکڑا ہوتا اور دروازے پر ہی گر پڑتا۔ شادی جو اس کے انتقام میں غضب کی سردی اور شدت کی گرمی کی پرواہ کئے بغیر دروازے کی چوکت پر اس کا راستہ دیکھ رہی ہوتی، اسے بڑی مشکل سے بہتر تک لاتی اور پھر اس کی ساری رات روتے ہوئے گزر جاتی۔ وہ شراب اور بازاری عورت کے سوا کسی چیز کے بارے

میں سوچنے پر قادر نہ تھا۔ پہلے تو وہ شامی کو صرف باتوں سے جلايا کرتا تھا۔ اب اس نے اس پر ہاتھ بھی اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ اسے بری طرح بیٹ ڈال لیکن وہ اف تک نہ کرتی۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر چوٹوں کے نشان نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ برداشت کئے جا رہی تھی۔ اس کا حس نام نہاد پڑ گیا تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے داخل ہوئی تھی۔ بائیس سال کی عمری کیا ہوتی ہے لیکن وہ تیس سال کی نظر آتی تھی۔

بھر شوکت نے اس کے دل پر ایک اور زخم لگایا۔ وہ عورتوں کو گھر لائے لگا۔ رات بھران کے ہمراہ رنگ رلیاں سنانا اور صبح ان کے ساتھ ہی گھر سے نکل جاتا۔ شامی چپ چاپ یہ سہم بھہ سہ گئی۔ لیکن آج اس سے نادانستہ طور پر ایک غلطی ہو گئی۔

آج رات جب وہ ایک فوجیان لڑکی کے ہمراہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو شامی اس کے پیٹ کی پٹی سے لگی بیٹی رو رہی تھی۔ اس کی ساتھی لڑکی نے بڑی نفرت سے اسے دیکھا اور بولی۔

”شوکت۔ یہ کون ہے؟“

”ارے۔ یہ ہماری نوکرانی ہے۔“ اس نے لڑکی کی کمر میں بازو محال کرتے ہوئے کہا اور شامی ترپ گئی۔ اس نے بجلی چلوں سے شوکت کو دیکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

”شوکت۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ فراڈ کر رہے ہو۔ یہ لڑکی تمہاری بیوی تھی تاں اور تم نے اسے اپنی نوکرانی کہا ہے۔ اگر اس کی تم نے یہ حالت کی ہے تو مجھے بھی اپنا انتہام سوچ لینا چاہیے۔“ یہ کہا اور وہ لڑکی چلی گئی۔

شوکت اسے شادی کا جہانہ دے کر لایا تھا۔ اس نے اپنی ذلت اور ناگاہی کا سارا غصہ شامی پر نکالا اور شامی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ اس کی بیوی اس کی عزت و غیرت، ساری رات سردی میں ٹھنڈی رہی اور وہ غالم بڑے سکون سے بستر پر ڈا سو تا رہا۔

صبح ہو گئی۔

وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکلے لگا۔ نیکام اس کے چہرے

پر غصے کی علامات ظاہر ہوئیں۔ وہ لال بھسوکا ہو کر آگے بڑھا۔ شامی دروازے پر بیوش پڑی تھی۔ اس کا سارا جسم ٹیلا ہو رہا تھا اور وہ تار تار کپڑوں میں لبوس چھوٹی موٹی پی پڑی تھی۔ اس نے ایک زوردار ٹھوکر اس کے پھول سے جسم پر رسید کی تو وہ کراہ اٹھی۔ ”سرتاج!“ اسے ذرا سمدھ بدھ آئی تو اس کے ہونٹوں سے یہی لفظ نکلا۔ تب وہ نفرت سے پیچ پڑا۔

”خاموش رہو کیتا۔ دغہ ہو جاؤ میاں سے۔ تم میری بیوی نہیں ہو۔ اٹھو میاں سے۔ دور ہو جاؤ۔“ اس نے کئی ٹھوکرین مزید اس کے جسم پر رسید کر دیں۔ وہ کراہتی ہوئی بڑی مشکل سے کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں سانپ کی سی چمک لہرا گئی۔

”یاد رکھنا باؤ۔ شامی نے آج تک تمہارے کسی ظلم پر اف تک نہیں کی لیکن آج تم نے اس سے اپنا ہر ٹاپہ توڑ لیا ہے۔ اب وہ تمہاری بیوی نہیں صرف شامی ہے۔ میں پھر آؤں گی باؤ۔ سراپا انتقام بن کر اور میرا انتقام دیکھ کر ساری دنیا قہرا اٹھے گی۔ یاد رکھنا۔“

وہ لڑکھائے قدسوں سے جنگل والے راستے پر ہوئی۔

”ہوش۔ انتقام!“ وہ قہارت سے بڑبڑایا اور پلٹ کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھر شراب کے نشے میں دھت میز پر اونٹن حادہ تھا۔

☆☆☆

”بیٹی۔۔۔ یہ جہنم کیا ہوا۔ یہ تمہارے جسم پر نسل کیسے ہیں اور باؤ کہاں ہے؟“

شامی جھونپڑی میں پہنچ کر بیوش ہو کر گر چکی تھی اور سردار اپنی لاڈلی کو اس قدر بری حالت میں دیکھ کر ترپ اٹھا تھا۔ لڑکیوں نے اسے ایک طرف پیال کے بستر پر لٹا دیا جس پر نرم ریشم کی کھالیں چھپی تھیں۔ سردار نے بے ہوش شامی کو جلدی سے کوئی بڑی بوٹی مسل کر سنگھائی۔ دو لڑکیاں اسے پیچھے سے ہوا دینے لگیں اور دو لڑکیاں اس کے پاؤں کے نکودں پر مساس کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد شامی ہوش میں آگئی۔ سردار نے پھر وہی سوال کیا تو باؤ کے نام پر وہ بھڑک اٹھی۔ اس کا زور چہرہ لال بھسوکا ہو گیا۔

چوں سے پنکھا کر رہی تھیں۔ سردار نے باقی دونوں لڑکیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ایک دوا کی مالش شامی کے جسم پر شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد شامی سکون کی نیند سو گئی۔

سردار جھونپڑے سے باہر نکلا۔ باہر بستی کے تمام بچے، بوڑھے، جوان، مرد عورتیں جمع تھیں۔ سردار کو دیکھ کر ان کی جھنجھٹاہٹ ختم ہو گئی۔ سردار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہارمب لہجے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فلک کی کوئی بات نہیں۔ چند روز میں تمہاری شہزادی بالکل تندرست ہو جائے گی۔“ اور اس نے ان کو جانے کا اشارہ کیا۔ بھیڑ چھٹنے لگی اور تھوڑی دیر بعد وہاں کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں جت گئے، تاہم سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ ایسا کیسے؟ سردار نے سختی سے ان لوگوں کو جو اس واقعے سے باخبر تھے منع کر دیا کہ بستی کے لوگوں کو کچھ نہ بتایا جائے۔ کیونکہ یہ جان کر کہ ان کی شہزادی پر ظلم کئے گئے ہیں، بستی والے بے قابو ہو جاتے۔ پھر ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ تقریباً ناممکن۔

☆○☆

دو ہفتے گزر گئے۔ شامی کا جنگلی حسن پھر اپنے جوبن پر آ گیا۔ اس کے تمام زخم نر گئے۔ کندن سا کوئل بدن ہر قسم کی چوٹوں کے نشانات سے پاک ہو گیا۔۔۔ لیکن ایک زخم۔ ہاں ایک زخم ابھی تک ہر اٹھتا جس کا نشان اس کے دل پر تھا اور جو انتقام کے مہم سے ہی بھر سکتا تھا۔ ایک ہلکا سا نشان ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ کی پشت پر موجود تھا۔ یہ نشان شوکت کی ٹھوکر کا تھا۔ ٹھوکر سے اس کی کھال پھٹ گئی تھی۔ شامی کی نظر جب بھی اس نشان پر پڑتی، انتقام کا جذبہ پوری شدت سے سراٹھاتا۔ اس کا خون کھولنے لگتا۔ اسے شوکت کی بے وفائی اور ظلم کی یاد کسی بل جھن نہ لینے دیتی۔ وہ اس کے مظالم کو یاد کرتی تو اس کے دونوں ہاتھوں کی ٹھٹھیاں جھنجھ جاتیں۔ آنکھیں بند کر کے دانت کچکپاتے ہوئے وہ اپنی قسم دہراتی۔ اپنا وعدہ یاد کرتی اور تصور ہی تصور میں وقت کے ذریعے پھلانگی انتقام کی منزل تک پہنچ جاتی۔ ایسا انتقام۔۔۔ جو دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا زالا انتقام تھا۔ وحشت و برہت کا شاہکار۔ لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ شامی کیا کرنا چاہتی تھی۔ ایک خاموش طوفان تھا جو اس کے دل

”اس بچ کا نام نہ لو بابا۔ کیا میری حالت دیکھ کر بھی تمہیں احساس نہیں ہوا کہ یہ سب کیا دھرا کس کا ہے؟“

تو کیا؟“ سردار رک گیا۔

”ہاں بابا۔ سب شہری ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جسم کی ہوس کے پھاری۔ جب جی بھر گیا تو کسی بیکار بچہ کی طرح ٹھکرا دیا۔ پھینک دیا۔“ وہ عقارت سے بولی۔

سردار کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ اس نے اسی وقت چند کڑیل جوان بلا بھیجے۔ بابو کے خاتے کے لئے۔۔۔ لیکن شامی نے اسے روک دیا۔

”نہیں بابا۔ بات میرے اور بابو کے درمیان ہے۔ اس میں کسی کو آنے کی ضرورت نہیں۔ بابو نے زیادتی میرے ساتھ کی ہے۔ اس نے اپنے ظلم کا نشانہ مجھے بنایا ہے۔ پھر میرا ٹھکرایا ہے۔ کھلونا مجھے سمجھا ہے اور اب اسے اپنے انتقام کا نشانہ بھی میں خود ہی بنانوں گی۔“ وہ پر عزم لہجے میں بولی۔

”بیٹی!“ سردار نے کہنا چاہا۔

”کچھ نہیں بابا۔ تم صرف ایک کام کرو۔ مجھے اپنے اسے عمل کے لئے تیار کرو جو تم نے اس ذلیل آدمی کی خاطر روک دیا تھا۔“ شامی نے سردار کی بات کٹ دی۔

سردار کچھ سوچنے لگا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

”اچھا شامی۔ جیسے تیری مرضی لیکن پہلے تو تندرست ہو لے۔ پھر بات کریں گے۔“

”ٹھیک ہے بابا۔“ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ سردار جھونپڑے کے ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ وہاں شامی کی طرف آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا مٹی کا کٹورا تھا۔ جس میں کوئی سیاہی بالکل سیال تھا۔ اس نے آہستہ سے شامی کو پکارا۔ اس نے کسماکر آنکھیں کھول دیں۔

”یہ لی لو بیٹی! یہ تمہاری مٹی طاقت کو بحال کرے گا۔“ سردار نے کٹورا اس کی طرف بڑھا دیا۔

دو لڑکیوں نے شامی کو سارا دے کر بٹھایا۔ اس نے چند گھونٹ میں بد مزہ اور بدبودار سیال ختم کر دیا اور پھر لیٹ گئی۔ دونوں لڑکیاں اب بھی اسے سمجھ کر کے

کے گمرے سمندر میں پروان چڑھ رہا تھا۔ جب کبھی یہ طوفان اس کے دل میں اٹھتا تھا تو اس کی لہریں بابو کے مظالم کے پتھروں کی طرح اس کے دل پر ڈمک گاتیں۔ وہ تڑپ جاتی۔ لیکن ابھی اسے انتظار کرنا تھا۔ بہت زیادہ انتظار۔ ابھی اسے شوکت کے لئے کڑھا کھودنا تھا۔ جال لگانا تھا اور پھر اس کے شکار کے لئے تھلا لڑنا تھا۔ بالکل تھا۔

وہ اپنے بستر پر لیٹی شاید بلکہ یقیناً "شوکت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اچانک وہ چونک پڑی۔ کوئی جھونپڑے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے خیالات کی چلن ہٹا کر دیکھا۔ سردار اس کے نزدیک کھڑا تھا۔

"کیسی بے بیٹ ہے بچی؟" اس نے شفقت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں بابا۔" وہ جلدی سے اس کی تعظیم کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"مجھو بیٹی۔ کیا سوچ رہی تھیں؟

"کچھ نہیں بابا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں۔" سردار کچھ سوچنے لگا۔

"بابا ابھی کتنے دن اور مجھے انتظار کرنا پڑے گا؟"

"صرف چند دن اور بیٹی۔ میں تیرے لئے دو انیس بھی تو تیار کر لوں۔" سردار نے پیار سے کہا۔

"اچھا۔" وہ طویل سانس لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔

"اب تم آرام کرو بیٹی۔ رات کافی جا چکی ہے۔"

سردار نے اس کے ماتھے پر ہوسہ دیا اور اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔

شامی پھر اپنے خیالات کے گمرے سمندر میں گم ہو گئی۔ پھر سوچتے سوچتے نجانے کب وہ فینڈ کی دیوی کی نرم و نازک آغوش میں چلی گئی۔

☆○☆

صبح صادق کی جگہ پر روشنی ہر طرف پھیلنے لگی تھی۔ درختوں پر پرندوں نے بھانت بھانت کے راگ اپنے شروع کر دیئے تھے۔ شامی نے پرندوں کا شور سن کر آنکھیں کھول دیں۔ جھونپڑے کے کھڑی کنارے سوراخ سے صبح کی روشنی جھونپڑے کا اندر دھار دھار کرنے کی جتنی الوس کو شش کر رہی تھی۔ اس نے کسمار کر کھٹ بدلی

اور آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ایک بجائی لی اور جھونپڑے سے باہر آگئی۔

"سلام بابا۔" سامنے سے سردار کو آتے دیکھ کر اس نے کہا۔

"سدا سبھی رہو بیٹی۔ کہاں جا رہی ہو؟" سردار نے پیار بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر دی۔

"ندی پر بابا۔"

"اچھا بیٹی۔ لیکن ذرا جلدی آجنا میں تیرے آتے پر ہی کچھ کھاؤں گا۔"

"اچھا بابا۔" اور وہ ندی کی طرف چل دی۔

ندی پر اسے اپنی کھیاں مل گئی۔ وہ سب ندی میں اتر گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو پانی میں غوطے دے رہی تھیں۔ چوٹی سے پکڑ کر کھینچ رہی تھیں۔ پانی کے چھیننے اڑا رہی تھیں۔ ان کے مصوم قہقروں سے ماحول کا حسن بڑھ گیا تھا۔ شر کی پرکھی رنگ برنگی تھیلوں سے بالکل مختلف، مصوم اور سادہ حسن جنگل کی آزاد فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ شر کی ٹھنڈی آلود فضاؤں سے دور، جہاں ہر طرف مکر و فریب، دھوکے بازی، عیاری اور بے وفائی کا پتہ تھا، ان جنگلی لوگوں کی پرسکون دنیا تھی جو فریب نام کی بلا سے واقف ہی نہ تھے۔ وفا اور صرف وفا کے پتلے۔۔۔ لیکن جب کوئی ان سے بے وفائی کرتا تو وہ انتقام کی ہر منزل سے گزر جاتے۔ خود مٹ جاتے یا اس بیوقوف کو مٹا دیتے۔ شامی بھی اپنی سکھوں میں بالکل انہی کی طرح شرارتیں کر رہی تھی کسی کو احساس نہ تھا کہ وہ سردار کی بیٹی ہے۔ نہ وہ اس خیال سے مفرور تھی کہ وہ شہزادی ہے اور یہ اس کی رعایا۔ وہ سب ایک تھے۔ چھوٹے بڑے کی قید سے آزاد لیکن وہ شہزادی ہو یا رعایا، سردار کا حکم ماننا ان کا پہلا اور آخری فرض تھا خواہ جان چلی جائے۔ جب وہ اس کھیل سے آگے نکلیں، تھک گئیں تو باہر نکل کر درختوں کے سائے تلے ہری ہری گھاس پر لیٹ کر آرام کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہ سب ہنسی کھیلتی ہنسی کی طرف چل دیں۔

"آؤ بیٹی۔" سردار نے اسے جھونپڑے کے دروازے پر دیکھ کر کہا۔ وہ اپنے سامنے دودھ کے دو بھرے پیالے رکھے بیٹھا تھا۔

شامی نے دودھ پیا اور اپنے جھونپڑے میں آگئی۔



☆○☆

دو ہفتے مزید گزر گئے۔ شامی کے ممبر کا پتا نہ لبریز ہو گیا۔ وہ اب اور انتظار کرنے کو تیار نہ تھی۔

”بابا! اب تو بہت دن گزر گئے۔“

سردار اس کی بے چینی دیکھ کر ہنس پڑا۔ ”ہاں بیٹی۔“

”تو پھر اب۔ کیا ابھی دو انیس تیار نہیں ہوئیں؟“ وہ بے تابی سے بولی۔

”ہوں۔“ سردار سوچ میں پڑ گیا اور شامی کی بے چین نظریں اس کے چہرے

پر جم گئیں۔

”ٹھیک ہے بیٹی۔ کل سے میں تیرے لئے پھلا حصہ شروع کروں گا۔“ سردار

نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

”اچھا بابا۔“ اس نے کہا اور اپنے جھوپڑے میں آکر لیٹ گئی۔ سوچوں نے

اس کے ذہن کے گرد جال بننا شروع کر دیا۔ وہ اس جال میں پھنسی چلی گئی۔ کسی

بے بس پرندے کی طرح۔ جال تکھ ہوتا چلا گیا اور وہ اپنے ذہن کو کسی طرح بھی

اس جال سے نہ نکال سکی۔ اسے وقت گزرنے کا بھی احساس نہ ہوا۔ شام ہو گئی۔

سردار جھوپڑے میں داخل ہوا۔

”ارے۔ تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔ میں تمہیں باہر ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“

”اوہ۔ شام ہو گئی بابا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔“ وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سردار نے مٹی کا دیا روشن کر دیا اور جھوپڑے میں زور دی روشنی قہر خراے

گئی۔ ایک غامض بڑے سے پالے میں دودھ اور دوسرے ہاتھ میں پھلوں کا پیالہ

لے کر اندر داخل ہوئی۔ دونوں پیالے پھر کے چپوترے پر رکھ کر وہ اگلے پاؤں

لوٹ گئی۔

”بیٹی! میں یہ کہنے آیا تھا کہ کام بہت خطرناک ہے اور۔۔۔۔“

”بابا! بس اور کچھ نہ کہنا۔ میں صبح کا انتظار کروں گی۔“ اس نے سردار کی

بات کاٹ دی۔

سردار نے اس کی طرف دیکھا۔ ”جیسے تیری مرضی۔۔۔ پھل کھا کر دودھ پی

لو۔ صبح ہمیں بہت جلدی اٹھنا ہے۔“ سردار دھیمے لہجے میں کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ اپنے جھوپڑے کی کچھلی طرف بے ہوئے ایک اور بہت بڑے جھوپڑے کی طرف جا رہا تھا۔ اس جھوپڑے میں سانپ تھے۔ دنیا کے سب سے زیادہ زہریلے سانپ۔ اس جھوپڑے میں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ سردار سانپوں کو خود ان کی خوراک دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک آدمی غلطی سے اس جھوپڑے میں چلا گیا تھا اور اگلی صبح لوگوں نے اسے ایک عجیب الکلفت لاش کی شکل میں پایا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور سارے جسم میں ایک قہر خون کا موجود نہیں تھا۔ جسم پھول کر ہاتھی جیسا ہو چکا تھا۔ وہ کسی انسان کی لاش معلوم ہی نہیں ہوتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے جسم کے ہر مسام سے ایک سیاہی مائل سبز رنگ کا مادہ نکل نکل کر اس کے جسم اور زمین پر جم چکا تھا۔ اس دن کے بعد کسی کو اس جھوپڑے کے قریب جانے کی جرات نہ ہوئی تھی۔

سردار نے جھوپڑے میں داخل ہو کر گھاس پھوس کا دروازہ بند کر لیا اور کسی کو معلوم نہیں کہ سردار ساری رات اس جھوپڑے میں کیا کرتا رہا۔

☆○☆

صبح کاذب کی روشنی پھیل رہی تھی کہ سردار نے شامی کو آجگایا۔ وہ تو پہلے ہی ہنسنے لگی۔ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ سردار اسے لے کر سانپوں والے جھوپڑے میں داخل ہوا۔ اس کا نام سردار نے ”ناگ گھر“ رکھ چھوڑا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی شامی نے دیکھا کہ فیش ناگ ایک بڑے سے ڈکڑے میں کنڈلی مارے بیٹھا اپنے پھین کو لہرا لہرا کر پھنکار رہا تھا۔ دونوں نے جبکہ کر فیش ناگ کو تعظیم دی اور گھٹنے ٹیک کر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ سردار نمائے منہ میں کیا بڑبڑا رہا تھا۔ شامی فیش ناگ کے پھین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ توڑی دیر بعد سردار نے دونوں ہاتھ باندھے اور آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ وہ براہ راست فیش ناگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ شامی بھی کھڑی ہو گئی۔ آہستہ سے نظریں گھما کر اس نے سردار کی طرف دیکھا اور جھرجھری لے کر رہ گئی۔ سردار فیش ناگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نمائے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں بالکل دو دیکھتے ہوئے انکارے لگ رہی تھیں۔ سارے جسم کا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آگیا تھا۔ شامی نے جلدی سے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور سامنے دیکھنے لگی۔ اس



ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے گالوں پر سے پانی صاف کر دیا۔ پانی بہتا رہا۔ سردار صاف کرتا رہا اور شاہی کی تکلیف میں کمی آتی گئی۔ جب کافی دیر بند پانی بہتا بند ہو گیا تو سردار اسے سہارا دے کر اس کے جمبوٹیزوں میں لے آیا۔ شاہی کی آنکھیں بالکل سرخ ہو گئی تھیں۔ جیسے کبوتر کا خون۔

”بیٹی۔ آج کا کام اتنا ہی تھا اور ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ جب تک میں نہ  
 کوں تب تک باہر نہیں جانا۔“ اس نے سنا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

سرور نے ایک پڑا اور دودھ کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ کھاؤ۔“ اور اس نے پڑا کا زرد رنگ سنوف چماک لیا۔ سنوف کے منہ میں گھلتے ہی اسے لگا جیسے اس نے رائی کا کچ پیا یا تو لیکن جب دودھ نے سنوف کو اس کے پیٹ میں دھکیل دیا تو ایک بار پھر وہ مایہ پے آب کی طرح تر پڑے گی۔ جہاں سے سنوف گزرا اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنتیں کسی نے خنجر سے کاٹ دی ہوں۔ جیسے اس کے حلق سے لے کر ناف تک کسی نے جلنے کو کئے رکھ دیئے ہوں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام کر بستر پر اوندھی پڑ گئی۔ سرور نے جلدی سے پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور اطمینان اور تشویش کی ملی جلی کیفیت کی غماز نگہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہی تر پڑے تر پڑے بے حال ہو گئی۔ اس کی کراہیں بے ہمتی گئیں۔

”ہا۔۔۔ ہمارے جسم میں آگ۔۔۔“ اس نے رک رک کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کا سارا جسم پینے میں بھیگ رہا تھا۔

”برداشت کرو بیٹی۔“ سردار نے چار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شامی بہت دیر تک ترجیح رہی۔ پھر آہستہ آہستہ پر سکون ہوتی چلی گئی۔ سردار نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے خاموش سے دودھ اور پھل منگوا کر خود اسے کھائے پھر اسے آرام کرنے کا حکم کر چلا گیا۔ شامی نے بالکل سیدھے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر بعد اسے نیند نے آدرا چا۔

یہ تھا اس منزل کا پہلا زینہ --- جسے طے کرنے کے لئے اسے بے تحاشا تکلیف برداشت کرنا پڑی تھی لیکن تکلیف کے ہر احساس، شدید ترین احساس کو

ۛ محسوس کیا کہ فیش ناگ کے پھن کی حرکت ختم ہو چکی تھی۔ وہ پھن کو بالکل سیدھا کر کے سرداری کی آنکھوں میں دیکر رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے فیش ناگ کی آنکھوں میں کوئی تیز سی روشنی چمک رہی ہو اور لکھ بہ لکھ یہ روشنی بڑھتی جا رہی ہو۔ جوں جوں روشنی بڑھ رہی تھی، سرداری کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ اس کی بڑبڑاہٹ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ شاہی صرف ایک ہی لفظ سمجھ سکی۔ سردار بار بار ایک لفظ دہرا رہا تھا۔

”ناگ بیوتا۔ ناگ دیوتا۔ دیوتا۔ دیوتا۔“

سردار کی آواز جیسے قلع میں چٹنے لگی۔ آواز پھنس پھنس کر نکلنے لگی اور اس کے جسم پر رٹنے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کلاپ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی کپکپاہٹ بڑھنے لگی۔ وہ ڈولنے لگا۔ فیش ناگ بالکل ساکت تھا اور براہ راست اسے دیکھ جا رہا تھا۔ پھر ٹیکاک سردار کا چہرہ پسینے میں بیگم کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے چہرے پر کسی نے پانی کا پالہ الٹ دیا ہو۔ عجیب بات یہ تھی کہ سارے جسم میں سے صرف اس کا چہرہ ہی پسینے میں تر تھا۔ پسینے کے قطرے زمین پر گرنے لگے۔ پھر پسینے کا رنگ بدلنے لگا۔ ہلکے سرخی مائل قطرے اس کے چہرے سے گرے۔۔۔ پھر شامی نے واضح طور پر دیکھا کہ فیش ناگ نے آہستہ سے اپنے بھن کو حرکت دی اور سردار ڈول ہوا زمین پر آ رہا۔ اس کی بیڑا ہاٹ ختم ہو گئی۔ سردار نے گرتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لینے ہی لینے اس نے اشارے سے شامی کو بھینکنے کے لئے کہا۔ جب شامی اس پر بجلی تو اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اپنا سرخی مائل پسینہ اس کے چہرے پر مل دیا۔ پھر چند قطرے لگی پر لے کر اس کی آنکھوں میں چھنٹ دیے اور اٹھ کر جلدی سے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے

شامی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں میں خنجر بھونک دیئے ہوں۔ وہ تڑپنے لگی۔ ہاتھ چمڑانے کے لئے اس نے سارا زور صرف کر دیا لیکن سردار نے اسے قابو کئے رکھا۔ لمحہ بہ لمحہ شامی کی تکلیف بڑھتی گئی۔ وہ تڑپتی رہی۔ اس کی کراہیں جھونپڑے میں گونجتی رہیں لیکن سردار نے اپنا کام پورا کر کے دم لیا۔ شامی کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ زور دیک کالیس دار پانی۔ سردار نے ایک

انتقام کے شعلوں نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔  
کتنے بے جگر ہوتے ہیں یہ جنگلی۔۔۔ اور کتنے ہادفا۔

☆○☆

اگلی صبح سردار نے جب چوتھی مرتبہ اس کے جھونپڑے میں قدم رکھا تو وہ تب بھی سو رہی تھی۔  
”اٹھو بیٹی۔“ سردار نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔  
”اوں۔ کیا ہے بابا!“ وہ کھٹک بول کر بھر سونگئی۔

”بیٹی۔ دوا کو دیر ہو گئی تو ساری محنت پر پانی بھر جائے گا۔“ اور شامی نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سردار نے اسے دودھ کا پیالہ تمنا دیا۔  
اس نے دودھ کا پیالہ ختم کیا تو سردار نے خادمہ کو چند جڑی بوٹیاں دے کر ان کا سفوف تیار کرنے کو کہا۔ جب سفوف تیار ہو گیا تو سردار نے اسے ایک طرف پڑے ہوئے مٹی کے کٹورے میں ڈال دیا اور ایک شیشی کا کارک کھول کر کسی سیال کے چند قطرے اس سفوف میں پکائے اور ایک سلائی سے اسے ملائے لگا۔ پھر اس نے اس سفوف میں سے تھوڑا سا انگلی پر لیا اور ایک دوسرے کٹورے میں ایک سیال ڈالا۔ اس میں تھوڑا سا دودھ ملا کر اسے پٹاکا اور شامی کو منہ کھولنے کو کہا۔  
اس نے شامی کے ہاتھوں میں دودھ کا کٹورا تمنا دیا اور وہ سفوف اس کے منہ میں ڈال دیا جو اب سبزی مائل سیاہ رنگ کا ہو چکا تھا۔ شامی نے جلدی سے کٹورا منہ سے لگا لیا اور سفوف نگل گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک بت بڑا گولہ اس کے دل پر اٹک گیا ہو۔ آہستہ آہستہ اس کے دل پر اس کا دہاڑ بڑھنے لگا۔ شامی کا دم سمٹنے لگا۔ سانس لینے میں وقت پیش آنے لگی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ گولہ آہستہ آہستہ اپنا پھیلاؤ بڑھانے لگا ہے۔ جوں جوں اس کا جسم بڑھنے لگا توں توں اس کے سینے سے لے کر ناف تک آگ سی پھیلنے لگی۔ اس کا دودھ ان خون خیز ہو گیا۔ پھر آئے گئے۔ پھر اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔۔۔ اس کے بعد مسلسل چھپیں۔۔۔ اسے ایسا لگا رہا تھا جیسے اس کے جسم کے اندر اور باہر زخم لگا کر ان میں مرچیں بھردی گئی ہوں۔ وہ مرغ بھل کی طرح تڑپتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ

اس کی تکلیف کم ہونے لگی۔ جوں جوں تکلیف ختم ہوتی گئی، اس کی آنکھوں سے بننے والے پانی میں تیزی آتی گئی۔ زرد رنگ کا پانی جس میں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ سردار انگلی سے وہ پانی ایک کٹورے میں جمع کرتا رہا۔ حتیٰ کہ کٹورے کا ایک چوتھا حصہ پر ہو گیا۔ پھر شامی کی آنکھوں سے پانی بہنا ختم ہو گیا۔ اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔

”میں جاتا ہوں بیٹی۔ ابھی تمہیں پیشاب کی حاجت ہو گی۔ بائیں آ رہی ہے۔“  
سردار باہر نکل گیا۔

بائیں ایک ایجنٹ عسکری عورت تھی اور سردار کی پرانی خادمہ۔ اس کے باہر جاتے ہی بائیں اندر داخل ہوئی۔ اس نے شامی کو تعظیم دی اور آگے بڑھ آئی۔ تھوڑی دیر بعد شامی کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ بائیں نے ایک طرف پیال جمع کر کے اس پر اسے پیشاب کرنے کو کہا۔ وہ پیشاب کر کے پھر بستر پر لیٹ گئی۔ بائیں نے اس پیال کو ایک کپڑے میں باندھ کر ایک کونے میں ڈال دیا اور اسے تعظیم دے کر باہر نکل گئی۔

سردار بائیں کے باہر جاتے ہی اندر داخل ہوا۔ شامی آنکھیں بند کئے بستر پر لیٹی تھی۔ سردار نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سردار نے اسے دودھ کا پیالہ تمنا دیا۔ وہ بلی کر پھر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں بند کر کے بوجھ سے بند ہونے لگیں۔ چند لمحوں بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی گداز بانوں میں بلکورے لے رہی تھی۔ سردار نے کونے میں پڑی پیال کی ٹھنڈی انگٹھا لی اور باہر نکل گیا۔

☆○☆

شام ہو چکی تھی۔ سردار ”ناگ گھر“ سے سانپوں کو ان کی خوراک دے کر باہر نکلا اور وہ بولے ہوئے شامی کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔

”سردار۔“ اچانک ایک آواز سن کر وہ چونک پڑا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دلچسپ اور خوبصورت سا نوجوان اس کی طرف تیزی سے بڑھا آ رہا تھا۔

”ارے شامو۔ تم آ گئے!“ سردار نے اس کی طرف بازو پھیلا دیئے اور وہ

زیادہ نہیں لگتے تھے۔ وہ بڑے سے بڑے سانپ کو زیر کر کے سر جاسا تھا۔

کو پس پشت ڈال کر۔ اس راہ کا نام تھا۔۔۔ شامو۔

اسے ایک ایک بات یاد آئے گی۔

دوسری طرف شامو کا ذہن بھی اپنی برباد زندگی کے ماضی کی وصول اڑا رہا تھا۔

☆☆☆

شامی سردار کی بیٹی تھی اور شامو ان کے قبیلے کے بہادروں کا سردار۔ خوبصورت، فوجوان، دلیر شامو، شامی کی محبت میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ اس سے والہانہ پیار کرتا تھا۔ وہ جب بھی شامی کو دیکھتا، ہمت بنا کر ڈاکو دیکھ رہا جاتا۔ جب تک شامی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی وہ پلک بچکا بغیر اسے دیکھتا رہتا اور جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو ایک طویل سانس لے کر اس کے قدموں کے نشانات پر نظرسنجم ہوتا۔

”شامی۔ کاش میں تجھے اپنا دل چیر کر دکھا سکتا اور تجھے معلوم ہو سکتا کہ میرے دل کے ہر حصے پر صرف اور صرف شامی نقش ہے۔“ وہ بڑبڑاتا۔

اور ایک دن۔۔۔ شامی نے اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن لی۔ وہ ندی کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھا شامی سے محبت جتا رہا تھا۔ خود سے ہاتھیں کر رہا تھا۔ شامی درخت کے پاس سے گزرتی تو اس کی آواز سن کر رک گئی اور اس کی ہاتھیں سننے لگی۔ جوں جوں وہ شامو کی ہاتھیں سنتی گئی اس کا منہ بڑھتا گیا۔ پھر جب وہ برداشت نہ کر سکی تو درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔

”شامو۔۔۔“

وہ اس کی غصے سے لمبرور آواز سن کر چونک پڑا۔

”شامی۔۔۔ تم؟“ اس کی آواز طلق میں پھنس گئی۔ وہ تو شامی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو غصے کی لالی سے اور بھی حسین ہو گیا تھا۔ شامی نے اسے گالیاں تک دے ڈالیں لیکن اسے ایک لفظ کی سمجھ نہ آئی۔ وہ تو اس کے جھٹاتے ہوئے چہرے پر نگاہیں جمائے اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ شامی اپنا غصہ اتار چکی تو اس نے دیکھا کہ شامو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بت بنا اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”تم نے سنا نہیں؟ میں نے کیا کہا ہے۔“ وہ بھرپور شامی میں آگئی۔

”آں۔ کیا کا تم نے شرادی؟“ وہ چونک پڑا۔

”اوہ تو ہمیں کچھ خبر نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے!“ وہ پھر سے خرائی۔

”میں۔۔۔“ وہ بچکاری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو یہ۔۔۔ لو۔“ اور شامی کا دایاں ہاتھ اس کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ لیکن یہ

نشان اس کے دل پر نقش شامی کی محبت کے نشانات سے زیادہ گہرا نہ تھا۔

وہ بوقتِ بنا شامی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا پایاں ہاتھ گال پر تھا اور نگاہوں میں لاکھوں شکوے۔

”میرا خیال ہے۔ اب تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے۔“ اور وہ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی تیزی سے اپنے رستے پر ہوئی۔

اور شامو سوچتا رہ گیا۔ کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا؟

چھ روز بعد پھر شامی اور اس کا آتما سامنا ہو گیا۔ شامی نے بوئے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ اپنی سکیموں کے ساتھ ندی پر نہالے جا رہی تھی۔ شامو دوسری طرف سے ندی کے دوسرے کنارے چلا گیا۔ شامی ندی میں اتر گئی اور ساتھ ہی اس کی سکیمیں بھی۔ شامو درختوں میں چھپا اس کے کندن سے جسم کو دیکھتا رہا۔ اس کا سارا بدن پانی میں تھا۔ صرف گردن باہر تھی۔ وہ ایک دوسرے پر چمپنے ڈھاتی، شرارتیں کرتی، قہقہے لگا رہی تھیں اور جب تک وہ نہلاتی رہیں شامو اس کو دیکھتا رہا۔ صرف شامی کو!

جب وہ ندی سے نکل کر کمال جسم پر لپیٹ کر کھڑی ہوئی تھی تو شامو بے انتہا جذباتی ہو گیا۔ اس کا جی چاہا وہ خود اس کی ناگن سی سیاہ زلفوں کو اس کے چاند سے چہرے سے ہٹا دے۔ وہ ان پانی کے قطروں پر رشک کر رہا تھا جو اس کے حسین چہرے کو چوم رہے تھے۔ شامو دیکھتا رہا اور شامی اپنی سکیموں کے ہمراہ بہتی کو لوٹ گئی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا اور ہولے ہولے قدموں سے بہتی کی جانب چل پڑا۔

جب وہ بہتی میں داخل ہوا تو اسے پتہ چلا کہ سردار کو بہت سخت بخار ہے۔ موسمی بخار تھا اور سردار کے جسم پر داغے ابھر چکے تھے۔ اگر جلد ہی اس کا علاج نہ کیا جاتا تو اس کی موت کا خطرہ تھا۔ سردار کو جزی یونٹوں کی ضرورت تھی

لیکن۔۔۔ یہ جڑی بوٹیاں جنگل کے خطرناک ترین جیسے میں تھیں۔ جہاں ہر طرف زہریلے پھو اور سانپ دھنکتے پھرتے تھے۔ ہر قدم پر جان کا خطرہ تھا۔  
شامو اکیلا ہی جنگل کی طرف چل پڑا۔ بستی کا کوئی بھادر اس طرف جانے کو تیار نہ تھا لیکن شامو اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر چل پڑا۔ اس لئے کہ بستی کا سردار کم اور شامی کا ہاپ زیادہ تیار تھا۔

وہ سارا دن جنگل میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتا رہا۔ شام سے رات ہو گئی۔ اس نے تمام جڑی بوٹیاں حاصل کر لیں اور خوشی خوشی واپس چل پڑا لیکن خوشی قسمت۔ رات کے اندھیرے میں کسی زہریلے کیڑے نے اس کے ہاتھیں پاؤں پر کاٹ کھایا۔ اس کی پنڈلی سوج گئی لیکن وہ تکلیف کی پرواہ کئے بغیر چلا رہا۔ ورم آہستہ آہستہ پنڈلی سے اس کی ران پر پھیلنے لگا۔ درد کی شدت زور پکڑنے لگی۔ اس کے منہ سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔ وہ خود کو گھسیٹا ہوا وہ بستی کی جانب چلتا رہا۔ تکلیف بڑھتی گئی اور فاصلہ کم ہوتا گیا۔ جب وہ بستی میں داخل ہوا تو صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ بستی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے درد کو بہت ضبط کیا۔ محکب تک اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ وہ گھسٹا ہوا سردار کے جمونہڑے تک پہنچ گیا اور سر زمین پر ڈال دیا۔ ہاتھ بڑھا کر جمونہڑے کی گھاس پھوس کا دروازہ کھولا اور جسم کو پوری طاقت سے آگے کو دھکیلا۔ اندر دیا بھینے کو تھا۔ اس نے پوری طاقت جمع کی اور ایک بڑا ہٹ سی سناٹی دی۔

”سردار۔۔۔“

لیکن سردار بے ہوشی کی حالت میں تھا اور پاس بیٹھی شامی بھی شاید سو گئی تھی۔

اس نے ایک بار پھر بستی کی۔ ”سردار۔“

”کون؟“ شامی نے آنکھیں کھول دیں۔

”میں ہوں شزاودی۔ شامو۔۔۔ میں جڑی بوٹیاں لے آیا ہوں۔“ وہ اٹک اٹک کر بولا۔ شامی کی آواز سننے ہی اس کے جسم میں طاقت عود کر آئی۔  
شامی تیزی سے آگے بڑھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ اس کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

”میری ٹانگ پر کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ کھایا ہے شزاودی۔“ اور اس نے جڑی بوٹیوں والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”میری فکر مت کرو۔ سردار کو دوا دینا کرو۔“ اور اس کی آواز ڈوب گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

شامی نے جلدی سے جڑی بوٹیاں اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیں اور سوئے ہوئے خادموں کو چگا کر شامو کو اٹھانے کا حکم دیا۔ خادموں نے سردار کے قریب ہی پیال پر ریٹم کی کھالیں ڈال کر اس کے لئے بستہ لگا دیا اور احتیاط سے اسے لٹا دیا۔

شامو کی ٹانگ بہت زیادہ سوج چکی تھی۔ شامی نے ایک خادم کو مرہم دے کر اس کی ٹانگ پر مالش کرنے کا حکم دیا لیکن خادم کا ہاتھ گتے ہی شامو چیخ پڑا۔ شامی نے خادم کو احتیاط اور آہستگی سے مالش کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد شامو دوبارہ بے ہوشی کی انتہا گمراہیوں میں غرق ہو گیا۔ خادم نے مالش کر کے اوپر لیپ کر دیا۔ شامی نے جڑی بوٹیوں سے دوا تیار کی اور ایک مٹی کے پیالے میں ڈال کر سردار کے قریب چلی گئی۔

”بابا۔ اٹھو بابا۔ دوا پی لو۔“

سردار نے تھوڑی دیر بعد نیم غنودگی کی حالت میں آنکھیں کھولیں۔ ”کیا شامو آگیا بیٹی۔“ سردار نے دوا پیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بابا۔ اس کی لائی ہوئی جڑی بوٹیوں سے تو تمہیں دوا تیار کر کے چلا رہی ہوں۔“

”ارے۔۔۔ یہ اسے کیا ہوا۔“ سردار کی نظر شامو پر پڑی تو وہ چونک کر بولا۔

”اس کی ٹانگ پر کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ کھایا ہے بابا۔ خادم مرہم لگا گیا ہے۔“

”اوہ۔ اچھا بیٹی۔ اب تم جا کر آرام کرو۔ مجھے دوا پیتے ہی فرق محسوس ہوئے گا ہے۔“ سردار نے پیالہ اسے دیتے ہوئے کہا۔

گئے۔ آخر شامی اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟ کیوں کرتی ہے؟ کیوں کرتی ہے؟ اس کے ذہن پر ہتھوڑے سے برسے گئے۔ وہ آنسو ضبط کر کے اٹھا۔ ساری ٹانگ میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ٹانگ پر دباؤ پڑا تو وہ کراہ اٹھا مگر کسی نہ کسی طرح وہ اپنے جھوپڑے تک پہنچ گیا اور دھڑا سے بچال کے بستر پر گر پڑا۔ اس نے عرصے سے رکے ہوئے سیلاب کو رستہ دے دیا اور غامض مارنا ہوا سیلاب اشک ضبط کے تمام ہندھنوں کو توڑ کر اسے بہانے کیا۔

☆○☆

دن گزرتے رہے۔ شامو کی محبت اور شامی کی نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ جب بھی شامو کے سامنے آتی وہ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا اور شامی اسے بری طرح لٹاؤ دیتی لیکن اس کی یہی نفرت شامو کی محبت کا اٹھانے کا باعث بنتی گئی۔

اسی دوران شامو کو دوسری بستی میں کسی کام سے جانا پڑا۔ اسے وہاں کئی دن لگ گئے۔ وہ بے چینی سے کام نپٹا کر ہوا کے گھوڑے پر سوار واپس لوٹا۔ لیکن۔۔۔ ندی کنارے پہنچ کر جیسے کسی نے اس کا گھدہ دبا دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ جیسے کوئی پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑا ہو! یا کسی انجانی طاقت تلے اس کا وجود بھس کر رہ گیا ہو۔ وہ بالکل سیکے کی حالت میں کھڑا تھا اور سامنے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک شہری بابو اور شامی۔ بابو اور شامی۔ شامی اور بابو۔۔۔ اچانک چونک پڑا۔ وہ جس درخت کے نیچے کھڑا تھا اس پر سے کسی پرندے نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا ان دونوں کے پیچھے پہنچ گیا اور ایک درخت کے تنے کے پیچھے رک گیا۔ دونوں محبت بھری باتوں میں مگمگتے۔ دینا دینا سے بے خبر۔ بابو نے شامی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔ شامو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ آگے بڑھتا ہی جاتا تھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ شامی نے آہستہ سے شرابا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

”بابو۔۔۔ ہم تبا سے بات کرنا۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”صرف تمہارے کہنے کی دیر ہے۔“

”ج۔“ بابو نے خوشی سے بے قابو ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لے اور شامی

”اچھا بابو۔“ اور وہ بچالہ چہرے پر رکھ کر اپنے جھوپڑے میں چلی گئی۔ سردار پھر لپٹ گیا۔

صبح ہو گئی۔ ساری بستی کے بڑے بوڑھے اور جوان سردار کی خیریت معلوم کرنے آئے گئے۔ جب انہیں شامو کے کارنامے کا پتہ چلا تو اس پر واہ واہ کے بے ہمتاؤ و نگرے برسائے گئے۔ سردار نے ساری بستی کے سامنے شامو کی تعریف کی لیکن وہ سب سے بے خبر سکون کی نیند سو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جھوپڑا خالی ہو گیا۔ سردار کے لئے شامی دودھ لے کر آئی۔ سردار نے دوسرا بچالہ شامو کے لئے منکوا لیا اور دودھ پی کر خود پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

”شامی! بیٹی خیال رکھنا! شامو جاگے تو اسے دودھ پلا دینا۔“ سردار نے اپنے ہوئے کہا۔

”اچھا بابو۔“

کافی دیر گزر گئی تب شامو نے کراہ کر آنکھ کھول دی۔ شامی آہستہ سے اٹھی اور دودھ کا بچالہ لئے اس کے قریب چلی گئی۔

”شامو۔ دودھ پی لو۔“ اس نے شامو کے پاس جا کر کہا اور شامو کو ایسا لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے یہ قریب ہو۔ وہ اور شامی۔۔۔ اتنے قریب اور شامی اسے دودھ پلانے کے لئے کھڑی ہو۔ بچالہ ہاتھ میں لئے۔ لیکن ٹانگ میں اٹھنے والی ٹیس نے اسے حقیقت کا احساس دلا دیا۔ وہ آہستہ سے کھٹک کر ادھر کو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ تمام لیا اور ایک تک شامی کی طرف دیکھنے لگا۔ بچالہ دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں میں پیاری پیار تھا۔

شامی نے جب اسے اپنی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو اس کی ساری ہمدردی کافور ہو گئی۔ یکایک اس کی نظروں میں غنیمت و غضب کی بجلیاں لہرائیں اور شامو کے دل سے نکلنے والی پیار بھری صداؤں کو راکھ کر سکیں۔ شامو کے ہاتھ کاٹنے اور بچالہ زمین پر آ رہا۔ شامی اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی ہوئی ذہر نکل گئی اور شامو بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ

”میں شادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”مہر جاؤ لیکن جرف شکایت زبان پر مت لاؤ۔ تم نے بچی محبت کی ہے اور محبت جیسوں کی بھوکی نہیں ہوتی۔ روح کی پیاس کا نام ہی محبت ہے۔“

”مگر۔۔۔“

”بزدل مت بنو۔ کبھی کبھی محبت یک طرفہ قربانی چاہتی ہے اور اس وقت یہ قربانی تمہیں دینا پڑے گی۔“

”میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ ہٹ جاؤں گا۔“ اور اس کی آنکھوں نے ایک بار پھر سادوں بھادوں کا سماں باندھ دیا۔ اس نے بی بھر کر آنسو بہائے اور جب آنسو بھی خشک ہو گئے تو وہ درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر اسی راستے پر نظریں بھا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے باہر اور شادی بستی کی جانب گئے تھے۔ اس کی آنکھیں پھر دھندلا گئیں۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر چپکے اور اس نے دور سے آنکھیں میچ لیں۔ موتی پھسل کر اس کے گالوں پر سے ہوتے ہوئے زمین پر گرے اور مٹی میں جذب ہو گئے۔

”شادی۔ میں تیرے رستے میں نہیں آؤں گا۔ تیری خوشیوں کو پامال نہیں کروں گا۔ تو خوش رہے۔ سدا سکھی رہے۔“

اس نے ٹپکے ہوئے کو واہتوں میں دبا لیا اور تیزی سے پلٹ کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

☆○☆

شام دو سری بستی میں اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اس کے دوست نے شامو کی بستی میں جا کر پتہ کیا اور آکر اسے بتایا کہ آج سے چوتھے روز باہر اور شادی کی شادی ہے۔ یہ خبر سن کر شامو کے چہرے پر کوئی جذباتی تاثر نہ ابھرا۔ اس نے بڑے سکون سے یہ خبر سنی اور دو دن کے لئے غائب ہو گیا پھر جب لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ایک لکڑی کا ڈبہ تھا۔ اس میں کیا تھا؟ اس نے اپنے دوست کو بھی نہ بتایا۔

شادی والے دن وہ صبح ہی صبح بستی جا پہنچا۔ شادی کے ہنگامے دوروں پر

نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ جب باہر لے اسے اپنے سینے سے لگا کر بچھنے لیا۔

”کوئی دیکھ لے گا باہر۔“ شادی کسماسک اس کی ہانپوں سے نکل گئی۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھوں میں ہاتھ دینے شامو کی خشک اور غیر آباد زمین سے دور ایک نئی راہ پر چل نکلے۔

اور شامو۔۔۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا ان کے قدموں کے نشانات پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے ذہن میں لاوا سائل رہا تھا۔ کالوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن مدھم مدھم پڑ چکی تھی اور اس کے کالوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

باہر اور شادی کی شادی۔۔۔ باہر اور شادی۔ شادی اور باہر۔

”نہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے کالوں کو دھانپ کر چیخ پڑا اور اس کی آنکھوں نے بجاوت کر دی۔ وہ درخت کے تنے سے پلٹ گیا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو گا۔ نہیں ہو گا۔“ وہ روتے ہوئے بڑبڑایا۔

”لیکن اس کا بیوت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ اپنے کالوں سے سن چکے ہو۔“ اس کے دماغ نے چوٹ کی۔

”میں بھی تو شادی سے محبت کرتا ہوں۔“ اس نے سوال کیا۔

”لیکن شادی تم سے نفرت کرتی ہے۔“ اس کے دل نے کہا۔ دماغ نے تھدیت کی۔

”آخر کیوں؟“ وہ چیخ پڑا۔

”اس لئے کہ تم اس کی سہیلی کے بھائی کے قاتل جسے شادی اپنا بھائی مانتی تھی۔“

”لیکن وہ مقابلہ تھا اور مقابلے میں میں بھی مارا جاسکتا تھا۔“

”یہ بات شادی نہیں سمجھتی۔“

اور وہ سب پڑا۔ ”میں کیا کروں۔ کیا کروں؟“

”اپنی محبت کو اپنے دل میں دفن کر لو اور چپ چاپ شادی اور باہر کے رستے

سے ہٹ جاؤ۔“ دل نے کہا۔



تھے۔ ساری ہستی کو دلن کی طرح، شامی کی طرح سجایا گیا تھا۔ شامی کے جمونیزے کے کپڑوں سے لاد دیا گیا تھا۔ وہ سردار کے پاس پہنچا۔ وہ سامنوں کے جمونیزے سے باہر آ رہا تھا۔

”ارے شامو۔ تو کہاں چلا گیا تھا۔ سارے کام مجھے خود ہی بنانے پڑے۔“ سردار نے پیار بھری ناراضگی سے کہا۔

”معافی چاہتا ہوں سردار۔ کام زیادہ ہی لمبا ہو گیا تھا۔“

”اچھا۔ آؤ کام تو سب ختم ہو چکا ہے۔“ جمونیزے میں پہنچ کر وہ بیٹھ گئے۔ سردار خاموشی کو بدایات دیتا رہا اور سہ پہر تک سارا کام ختم ہو گیا۔ شامو نے سردار سے ضد کر کے کئی کام اپنے سر لے لیے اور محنتوں کے کام منٹوں میں ختم کر دیئے۔ خاص طور پر اس نے شامی سے متعلق تمام کام خود کئے۔ اپنا کٹری ڈاؤن اس نے ایک جانب سنبھال کر رکھ دیا تھا اور سردار سے کہہ دیا تھا کہ رخصتی کے وقت شامی کو دے گا۔ سردار نے باپ کی تعریفوں کے پلے باندھ دیئے اور اسے بتایا کہ سپیروں کے جشن کی رات جب شامو دوسری ہستی میں تھا باپو ان کی ہستی میں آ نکلا تھا۔ شامی اور شامو نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور نتیجے میں باپو کے اصرار پر اسے یہ شادی کرنا پڑی۔

شام ہر رسی تھی۔ شامی کو دلن بنا کر جمونیزے سے باہر لایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باپو اپنی قیمتی کار پر آگیا۔ اس کے ہمراہ اس کے صرف چار دوست تھے۔ سردار نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور ان کو عزت سے بٹھایا۔ خادم شربت بھرے پیالے لے آئے۔

تھوڑی دیر بعد قبیلے کی ہنگامہ نما رسوم شروع ہو گئیں۔ رات ایک چہر پاجکی تھی، جب تمام رسموں سے فراغت ہوئی اور قبیلے کے رواج کے مطابق شامی کو باپو کے حوالے کر دیا گیا۔ باپو اور شامی کے چہرے دکھ رہے تھے۔ اتنی جلدی اپنی منزل کسی کو ملتی ہے۔ شامو۔۔۔ سینے پر پتھر رکھے بڑی مشکل سے ضبط کئے کھڑا تھا۔ شامی دلن بنی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان والے نے سارا حسن اسے بخش دیا ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ سرخ ہونٹ پھڑپھڑا رہے

تھے۔ گلابی عارض دکھ رہے تھے اور آنکھیں شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔ شامی جب نکلیوں کے جھرمٹ میں شامو کے قریب سے گزری تو ایک لمبے کے لئے شامو اور شامی کی نظریں مل گئیں۔ شامو کے ہاتھوں سے دامن ضبط چھوٹے چھوٹے رہ گیا۔ اس نے آنکھوں میں امڈتی نمی کو روکا۔ پھر کتے، لرزے ہوئوں کو دانتوں میں داب لیا۔ کاپٹے گوشوں کو بھیج لیا لیکن اس کی یہ دگرگوں حالت شامی سے چھپی نہ رہ سکی اور اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں میں تھما ہوا ڈبہ آگے بڑھا دیا۔

شامی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈبہ لے لیا۔ بجائے کیوں اس کے ہاتھ کانپ سے گئے۔ وہ آہستہ آہستہ ڈبہ کو کھولنے لگی۔ شامو تیزی سے پلٹا اور جھوم سے نکل کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

”شامو۔ ارے شامو۔“ سردار نے اسے کئی آوازیں دیں مگر وہ اندھیرے کی دھند چادر میں او جھل ہو چکا تھا۔

”چٹا۔“ سردار نے پیار سے کہہ کر شامی کی طرف دیکھا۔ وہ ڈبہ کھول چکی تھی۔ جب اس نے ڈبے میں دیکھا تو لے بھر کے لئے اس کا دل اچھل کر مٹ گیا۔ آگیا۔ آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئیں۔ ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے اور ان دھماکوں کی کان پھاڑ آوازیں میں اس نے ایک گزرے واقعے کا عکس محسوس کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے خیال ہی خیال میں ایک گزرا ہوا منظر دیکھا۔

”اس نے شامو کے ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ تھما دیا اور شامو نے اپنی حیرت زدہ نظریں شامی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھامے وہ شامی کو پیار بھری نظروں سے گھورے جا رہا تھا اور شامی نے اسے اس طرح اپنی جانب دیکھنے پر اسے تھراؤ نظروں سے دیکھا۔ شامو لرز گیا۔ ایک چمکانے سے دودھ کا پیالہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ دودھ بکھر گیا اور شامی اسے قہر غضب سے گھورتی ہوئی جمونیزے سے باہر نکل گئی۔“

ڈبے میں ایک پیالہ تھا۔ بالکل نیا پیالہ۔ بالکل اسی طرح کا جیسا شامو کے

ہاتھوں ٹوٹا تھا۔  
 شامی کی آنکھوں میں اداسی کے سائے لہرا گئے اور پلکیں نم ہو گئیں۔ شامو نے اس کی نفرت کے بدلے اسے اپنے دل کا نذرانہ دے دیا تھا۔ اس کی شادی پر اسے دل کا تختہ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے کے لئے پیٹاب ہو گئے لیکن اس نے شبہ کا دامن مضبوطی سے قلم لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پیالے کو سمجھ لیا اور آنکھیں بند کر کے باہر کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔  
 ”یہ پیالہ مجھے دے دو بیٹی۔“ سردار کی بھرائی ہوئی آواز سن کر وہ ٹھٹھکی۔  
 اس نے رخ پھیرے بغیر ہاتھ پیچھے کو پھیلا دیا۔ سردار نے پیالہ لے لیا اور شامی نے وہ ہاتھ سمجھ لیا جیسے کوئی چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی ہو۔ سردار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شامی پلٹ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنکھوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ پھر شامی باہر کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی اور سردار جھٹکے جھٹکے قدموں سے پیالہ قلم اپنے جھونپڑے میں آگیا۔  
 ”تو نے بہت دیر کر دی شامو۔ بہت دیر کر دی۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ”تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا بچکے۔۔۔“

☆○☆

ایک ماہ گزر گیا۔ سردار کو پتہ چلا کہ شامو ساتھ والی بستی میں ہے۔ وہ خود جا کر شامو کو واپس لے آیا۔ شامو نے کوئی ٹیل و جت نہ کی۔ وہ چپ چاپ سردار کے ہمراہ بستی میں لوٹ آیا۔ سردار نے بھی مجھے وقت کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اب شامو سردار کا نائب تھا۔ سردار ہر کام میں اس سے مشورہ کرتا۔ سردار اور شامو کے حکم میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔  
 لیکن۔۔۔ ان سب باتوں کا مرہم بھی شامو کے دل کا زخم اچھا نہ کر سکا۔ وہ اب ہر وقت چپ رہتا۔ کسی سے زیادہ بات نہ کرتا۔ سردار اس کی ولجھتی کرتا رہتا مگر جب اس کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی تو اس نے شامو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ شامو اگر ساری بستی میں نہ ملتا تو وہ نندی کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھا مل جاتا۔ درخت کے نیچے بیٹھا وہ اسی راستے پر نظریں جمائے رہتا جہاں باہو اور شامی

کے قدموں کے نشان اس کی محبت کو پامال کرتے ہوئے اسے دکھائی دیتے اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ وہی درخت تھا جہاں اس نے باہو اور شامی کو بیٹھے پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا۔  
 وہ شامی کے لوٹ آنے کی امید میں ہی رہا تھا۔ شامو کبھی شامی لوٹ آئے۔ کبھی لوٹ آئے۔

اسی مہم کی امید کے سارے وہ جئے جا رہا تھا۔ شامی کے انتظار میں۔ اس شامی کے انتظار میں جو اس سے نفرت کرتی تھی۔ اسی شامی کے انتظار میں اس نے ساڑھے تین سال گزار دیے۔ بستی کی خوبصورت ترین لڑکیوں نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن شامو کو کوئی ایسی لڑکی نظر نہ آئی جس میں اسے شامی کی جگہ ہی جھلک بھی نظر آتی۔ اسی لئے وہ شامی کے لوٹ آنے کی امید میں زندگی گزار رہا تھا۔

اور ایک دن۔۔۔

اسے ایک خبر کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی امید پر آئی تھی لیکن عجب دکھ بھرے انداز میں۔

اسے معلوم ہوا کہ شامی لوٹ آئی ہے۔ باہو نے اس پر ڈیڑھ سال تک بے پناہ مظالم توڑے ہیں۔ اس کے پھول سے کوئل جسم پر باہو کی سزاؤں کے نشانات ابھی تک اس کی تنگدلی کی داستان بنا رہے ہیں۔  
 شامو کا خون کھول اٹھا۔ وہ باہو سے انتقام لینے کے لئے بھڑک اٹھا لیکن سردار نے اسے شامی کا فیصلہ سنا دیا کہ وہ اپنے انتقام میں کسی کو بھی مداخلت نہ کرنے دے گی۔ شامو نے سر تسلیم خم کر دیا۔

لیکن اس نے سردار سے ایک بات منوالی۔

”سردار۔ میری ایک آرزو پوری کر دو۔“ اس نے سردار سے کہا۔

”تو کہہ کے تو دیکھ شامو۔“ سردار کا رواں رواں اسے خوش دیکھ کر پر سکون ہو گیا۔

”سردار! میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔ کہ اگر شامی کا کوئی کام ہو تو تم صرف مجھے

کہو گے۔ مجھے حکم دو گے۔ میں اس کے کام کے لئے۔۔۔ اپنی جان بھی دے دوں گا۔ میں۔۔۔

اس نے بیگانہ انداز میں اپنا فسانہ کہہ دیا۔

سردار نے اس کے شانے سے ہاتھ اٹھالیا اور اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

”ٹھیک ہے شامو۔ جو کام تیرے کرنے کا ہو گا وہ صرف تو ہی کرے گا۔“

سردار کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”اور سردار۔ میں۔۔۔ میں“ وہ خوشی کے مارے دیوانہ سا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فکر کے آنسو۔ خوشی کے آنسو۔ وہ تیزی سے پٹا اور اپنے جھوپڑے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”شامو۔ او شامو۔“ سردار نے اسے پکارا۔

”کیا ہے سردار۔“ وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کر کے اس کی طرف

پٹا۔

”شامی سے نہیں ملے گا!“

”میں سردار۔ جب وہ پوری طرح صحت مند ہو جائے گی تب ملوں گا۔“ اس نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“

وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس کا تپی چاہا کہ وہ زور زور سے ہنسنے۔ خوب

تھکے لگائے اور بھر دل کھول کر روئے۔ خوب روئے۔۔۔ تب اس نے زور زور

سے ہنسا شروع کر دیا۔ وہ بستر پر گر پڑا۔ وہ ہنسا رہا اور آنکھوں سے آنسو بہتے

رہے۔ اس نے ساری چیزیں ادھر ادھر پھینک دیں۔ تھوڑی دیر میں جھوپڑا کباڑ

خانہ معلوم دے رہا تھا۔ اسی طرح وہ ہنسنے، روتے ہوئے بے حال ہو گیا۔ وہ انجانی

سوچوں میں کھو گیا۔ تب بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں غمی تھی۔

ایک ماہ گزر گیا۔ تب ایک دن سردار نے اسے بلا کر کہا۔

”شامو۔ میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ ورنہ اس کام کے لئے خود جاتا۔“

”حکم سردار۔“ وہ سمجھ گیا اور جلدی سے بولا۔

”سن شامو۔ تجھے ایک بہت خطرناک کام کرنا ہے جس میں جان کا بہت زیادہ خطرہ ہے۔“

”مجھے کام بتاؤ سردار۔“ وہ بے چینی سے بولا۔

”تو سن۔ ناگ راجہ کا منکا چاہئے۔“ سردار نے غور سے اسے دیکھا اور اس نے ایک لمبے میں فیصلہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے سردار۔ میں آج رات ہی روانہ ہو جاؤں گا۔“

”جیسے تیزی مرضی۔ یہ لے۔ یہ گلے میں ڈال لے۔“

سردار نے اپنے گلے سے ایک ہار نکال کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اس میں ایک ہی منکا تھا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جس کے گلے میں ان کے سردار کا دیا ہوا اس ہار کے ہار ہو گا، ناگ اس کے قریب آتے ہوئے گھبرا نہیں گئے۔ شامو نے اوپ سے سر جھکا دیا۔

”اچھا سردار۔ میں چلتا ہوں۔ اب تیاری کروں گا۔“

”مٹھر شامو۔“ سردار نے اسے روک لیا اور اپنا لعاب انگلی پر لے کر اس کے ماتھے پر تلک سالگا دیا۔ شامو کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سر بہت ہلکا ہو گیا ہو۔ جیسے اس کے سر کے گرد کوئی چیز لپٹی ہوئی ہو۔ سردار آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی انگلی پر تھوڑا سا لعاب لیا اور اس پر پھونک مار کر اس کے دونوں ہاتھوں پر تلک لگا دیئے۔

”اب ناگ راجہ کا دار تھہ پر مشکل ہی سے چلے گا۔“

”شکریہ سردار۔“ شامو نے آہستہ سے کہا۔

وہ جھوپڑے سے نکلنے نکلنے وہ رک گیا۔ ”کیا بات ہے شامو؟“

”سردار۔ شامی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ناں!“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ تو آئے گا تو خود ہی مل لیتا۔“ سردار مسکرایا۔

اور وہ سر ہلاتا ہوا اپنے جھوپڑے میں آ گیا۔

اس نے اپنا بیٹھنوں سے ایک طرف لٹکا ہوا پائال اتارا۔ اپنی بین کو اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر پٹارے میں رکھا اور دوسری ضروری چیزیں بھی پٹارے میں رکھ کر

شام ہوئے کا انتظار کرنے لگا۔

شام ہو گئی۔۔۔ وہ اٹھا۔ سردار نے اسے رخصت کیا اور وہ اس کے سامنے جگل کی جانب چل پڑا۔ لیکن جگل کی طرف کہاں؟ وہ تو جموں پڑوس میں سے ہو کر شاہی کے جموں پڑے کی پشت پر جا نکلتا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے سوراخ کے اندر جھانکا۔ شاہی بالکل سیدھی لیٹی سو رہی تھی۔ وہ پہلے کی مانند سرخ و سپید نظر آ رہی تھی۔ اس کی کزوری دور ہو چکی تھی۔ وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

”تو سدا سسکی رہے شاہی۔ سدا سلامت رہے۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر جگل کی اندھیری گھڑیوں پر غائب ہو گیا۔

اسے جگل میں بھٹکتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا لیکن ناگ راجہ کا نشان تک نہ ملا۔ وہ مایوس ہو گیا۔ اسے واپس جانے کی بے چینی تھی لیکن ناکام واپس جانا اس کے لئے موت سے کم نہ تھا۔ وہ مایوس ہو کر ایک درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ درختوں پر پرندے چھرا رہے تھے۔ ان کی سریلی آوازیں عجب سناں پیدا کر رہی تھیں۔ بگی بگی ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے اور جھاڑیاں سرسرا رہی تھیں۔ وہ شاہی کے تصور میں کم ہر چیز سے بے نیاز بیٹھا تھا کہ توڑی دیر بعد اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔

اس نے غور سے دیکھا۔ سنا۔ اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پرندوں کی آوازیں ٹپٹیک بند ہو گئی تھیں۔ ہوا رک گئی تھی۔ ایک خوابناک سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ کوئی آواز نہ تھی۔ کوئی حرکت نہ تھی۔ ہر چیز ساکت تھی لیکن جلدی وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے گرد ایک دائرہ کھینچا اور اس میں اپنا ہتھارہ کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھٹنے زمین پر ٹپک دیئے اور چمڑی سے اپنے آگے چند آڑی ترچھی کپیریں کھینچ دیں۔ ان لکیروں کے مرکز میں اس نے ایک دائرہ بنادیا۔ ہتھارے میں ہاتھ ڈال کر اس نے چند بچ نکالے۔ عجیب سی رنگت کے بچ تھے۔ سیاہ مائل نارنجی رنگ کے اور شکل بالکل دل کی مانند تھی۔ اس نے وہ بچ اس دائرے میں رکھ دیئے اور جلدی جلدی کچھ بدبوائے لگا۔ تب اس نے ایک زور دار نعرہ بلند

کیا۔

”شوگا!۔۔۔ پھر اپنا ہاتھ زمین پر ٹپک دیا اور کچھ پڑنے لگا۔ پھر خاموش ہو کر توڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں عجیب سی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ بالکل ویران آنکھیں۔۔۔ جن میں زندگی کی رقت تک نہ نظر آتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خوف آتا تھا۔ بالکل سرخ اور ویران آنکھیں۔ خوابناک سی کیفیت کی غمازی کر رہی تھیں۔

اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھ بڑھا کر بین اٹھائی۔ بین کو آہستہ آہستہ وہ ہوٹوں تک لے گیا اور جو بنی بین اس کے ہوٹوں سے مس ہوئی جھاڑیوں میں بگی سی سرسراہٹ بلند ہوئی، جیسے کوئی دبے پاؤں چلا آ رہا ہو۔ پھر کسی چیز کے رینگنے کی آواز سنائی دی اور یہ آواز سننے ہی شامو کی بین نے اپنا راگ چھوڑ دیا۔ وہ آنکھیں جھاڑیوں پر جمائے بین بجائے لگا۔

ایک عجیب سا راگ چمڑ گیا تھا۔ جیسے کوئی درد بھری آواز میں کسی کو پکار رہا ہو۔ شامو کی نظروں نے بالکل واضح طور پر دیکھا کہ جھاڑیاں ایک مرحبہ زور سے ہلکیں، پھر ان میں شعلے بھڑک اٹھے۔ جھاڑیاں چلتے گئیں اور شامو کی بین کی لے تیز ہو گئی۔ بلند ہو گئی۔ جھاڑیوں سے آگے تقریباً ”ویڑھ فٹ“ ایک سبز رنگ کا ناگ بیٹھا تھا۔ وہ پھکار رہا تھا۔ بے چینی سے سر ادھر ادھر پھینک رہا تھا۔ شامو کی بین کی لے کچھ اور بلند ہو گئی۔ ناگ کا پھن لہرائے لگا۔ دائیں بائیں وہ اپنے پھن کو حرکت دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے نٹے میں ہو۔ آہستہ آہستہ شامو کی بین کی لے عروج پر پہنچ گئی۔ تیز اور بلند لے۔ شامو کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ ویران ہو گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ صرف ہاتھ اور گال حرکت میں تھے۔ ناگ کے سر پر صاف طور پر تاج نظر آ رہا تھا۔ سترے رنگ کا تاج۔ جھاڑیوں کی آگ سر ہو چکی تھی اور ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔۔۔ یہی ناگ راجہ تھا۔ جس کی ایک پھکار سے شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ کتنا غلغلہ زہر تھا اس کا۔

شامو ہر قسم کے احساس سے بے نیاز بین بجائے جا رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ معمول پر آتی جا رہی تھیں۔ ان میں زندگی کی رقت نظر آئے گی

حاصل کر لیتا۔ اگر ناگ راجہ دائرے میں داخل ہو جاتا تو اس کی ساری طاقت چھین جاتی۔۔۔ بہر حال مقابلہ عروج پر تھا اور آنے والے چند لمحوں میں فیصلہ ہونا چھٹی تھا۔ ناگ راجہ کو کیا تو خود دائرے میں جانا تھا یا شامو کو باہر کھینچنا تھا۔

دوسری بار پھر اس کے چھین کو بکلی سی حرکت ہوئی۔ شامو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دماغ پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور اسے ایک زبردست جھکے کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ باہر جا کر آئے، گلے میں پڑا ہوا سردار کا دیا ہوا منکا حرکت میں آیا۔ وہ اڑ کر شامو اور ناگ راجہ کے درمیان حائل ہو گیا۔۔۔ ناگ راجہ کی کراہ صاف طور سے شامو نے سنی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منکے کے درمیان میں آئے ہی اس کی ساری طاقتیں عود کر آئی ہوں اور ساری تکلیف کا فور ہو گئی ہو۔ وہ پھر منکھوں کے بل بیٹھ گیا اور بین کی لے دہیں سے بلند ہوئی جہاں سے ٹوٹی تھی۔

ناگ راجہ کی کراہ بالکل ایسی ہی تھی جیسے وہ سخت زخمی ہو گیا ہو۔ اس نے تڑپ کر پیچھے ہٹنا چاہا۔ جیسی شامو کے سامنے رکے ہوئے بیچ اچانک ہوا میں تیرتے ہوئے اڑے اور ناگ راجہ کے سر کے گرد انہوں نے ایک حصار سا بنا لیا۔ شامو نے دیکھا کہ ناگ راجہ بے بسی سے پہلو بدل رہا ہے لیکن بیچ اس کے سر پر بالکل رقص کے انداز میں تیر رہے ہیں۔ پھر وہ بیچ دائرے کی طرف چل پڑے اور ناگ راجہ اضطراب کی حالت میں بیچوں کی قید میں تڑپتا دائرے میں داخل ہو گیا۔ شامو نے ایک لمحے کے لئے بین ہونٹوں سے جدا کی اور اس کی زور دار آواز کونجی۔

”شوگا۔“

پھر اس کی بین نے ایک دوسرا داگ الاپنا شروع کر دیا۔ بیچ ناگ راجہ کے گرد رقص کر رہے تھے۔ اچانک ایک بیچ نے ناگ راجہ کے سر پر چوٹ لگائی اور پھر رقص کرنے لگا۔

جنوبی پہلی چوٹ ناگ راجہ کے سر پر پڑی، ایک بکلی سی کراہ بلند ہوئی اور اس نے اپنا سر زمین پر پک دیا۔ اسی وقت شامو کا منکا پھر اس کے گلے میں اپنی اصلی

تھی۔ شامو پسینے میں نہائے جا رہا تھا اور ناگ راجہ۔۔۔ وہ اپنے چھین کو لہرائے جا رہا تھا۔ وہ اب دائرے سے تقریباً ”ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ بار بار اپنی زبان باہر نکالتا اور چٹکراتا لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے کوئی بے چینی ہے۔ نجانے کیسی بے چینی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں اور شامو کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، آہستہ آہستہ چاند بلند ہو رہا تھا۔

شامو کے ہونٹوں سے بین جدا نہ ہوئی۔ ناگ راجہ کی آنکھیں اب بھی اس کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ اب اس کا چھین بھی بالکل ساکت تھا۔ چاند نے اپنی ٹھنڈی اور سکون بخش چاندنی کی کرنوں سے جنگل کو جھلکا دیا لیکن جوں جوں اس کی چاندنی بڑھ رہی تھی، خطرناک لمحے قریب آتے جا رہے تھے۔ پھر جب چاند پورے جوہن پر آگیا تو فیصلہ کن لمحات آ پھینے۔ شامو کی بین کی لے یکدم تیز ہو گئی۔ تیز ترین لے اور بلند ترین بھی۔ اس کی اگلیاں بین پر تیزی سے حرکت کرنے لگیں اور ناگ راجہ کی بے چینی میں یکدم اضافہ ہو گیا۔ وہ شامو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ اس کا چھین ساکت تھا لیکن باقی تمام جسم حرکت میں تھا۔ اس نے اضطراب کی حالت میں ایک زوردار ہتھکڑ خارج کی اور اس کے چھین میں آہستہ سے حرکت ہوئی۔۔۔ جو بھی اس کا چھین ہلا۔ شامو کے جسم کو ایک زور وار جھٹکا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ناگ راجہ کی آنکھیں اب اپنی متناطیسی کشش سے اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ وہ آگے کو گرتے گرتے پچھا۔ اس نے بین کی لے کو اور تیز کر دیا۔ ناگ راجہ کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

کیا عجیب منظر تھا!

ایک انسان اور ایک ناگ میں مقابلہ ہو رہا تھا۔

ہر طرف سانٹے کی کھرائی تھی۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت اور جھاڑیاں بالکل ساکت کھڑی دیکھ لگتے تھے۔ ایک دہشتناک منظر تھا۔ دونوں کی کوشش تھی کہ ایک دوسرے کو زیر کر لیں۔ شامو اگر ناگ راجہ میں جتنے میں آ کر باہر جا کر آتا تو اس کی دردناک موت چھٹی تھی اور اگر وہ ناگ دھونک وائرے کے اندر لائے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ بڑی آسانی سے منکا

اس نے فوراً "ہاتھ پدھاک پٹارہ اٹھایا۔ اس میں سے ایک قھیلی نکال کر منکا اس میں احتیاط سے رکھا اور اس کا منہ باندھ دیا۔ قھیلی پٹارے میں ڈال کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ رات ایک چڑھائی باقی رہ گئی تھی۔

اس نے ایک نظر ناگ راجہ کی طرف دیکھا جو بالکل ساکت اور اودھ موا سا دائرے میں پڑا تھا۔ اس نے پٹارہ کندھے پر ڈالا اور پلٹ کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ وہ جلد سے جلد بستی پہنچ جانا چاہتا تھا، اس لئے وہ جتنی تیز چل سکتا تھا چلتا ہوا صبح سے کچھ دیر بعد بستی پہنچ گیا۔

☆○☆

"شامو۔ او شامو۔"

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور سوچوں کے عمیق سمندر سے باہر آ گیا۔ ایک آدمی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کی سوچوں کا تانا بانا ٹکڑا گیا۔

"کیا ہے؟" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"وہ۔ وہ۔۔۔ سردار بلا رہا ہے۔" وہ آدمی سسم گیا۔

"چلو۔" دونوں بستی کی طرف چل پڑے۔

وہ سردار کے جھونپڑے میں داخل ہوا۔

"آؤ شامو۔" سردار نے اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

"کیا حکم ہے سردار۔" اس نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

"بھئی میں نے شامی کو تباہ دیا کہ منکا تم لائے ہو۔ وہ تمہیں پوچھ رہی تھی۔"

"مجھے!؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں بھئی۔ جب سے وہ آئی ہے تم ایک بار بھی اسے نہیں ملے۔ حالانکہ اب

وہ بالکل تندرست ہے۔"

"اچھا سردار۔ میں آج ہی اسے مل لوں گا۔" وہ اپنی خوشی سے کپکپاتی ہوئی آواز پر قابو پا کر بولا۔

"بس۔ مجھے اتنی ہی کہنا تھا۔ شامی نے تمہیں پوچھا تھا، میں نے تمہیں بتا دیا۔"

"میں چلتا ہوں سردار۔" وہ خوشی کے مارے امڈ اٹھے والے آنسوؤں کو

حالت پر آگیا۔ شامو نے اپنی بین کی لے تیز ہوتی گئی اور بچوں کا رقص تیز ہوتا گیا۔ پھر انہوں نے ناگ راجہ کے سر پر مسلسل اور زوردار چوٹیں لگائی شروع کر دیں۔

رات آدھی باقی رہ گئی تھی اور چاند کی چاندنی جوین پر تھی۔ ناگ راجہ کی کراہیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔ وہ کراہتے کراہتے بے حال ہو گیا اور اپنا سر زمین پر بار بار مٹکنے لگا لیکن بچوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ پھر ناگ راجہ اودھ موا ہو کر رہ گیا۔ اس کے جسم کی حرکت ختم ہونے لگی حتیٰ کہ وہ بالکل ساکت ہو گیا۔

تب اچانک شامو کے گلے سے ایک بار پھر منکا اڑا اور سیدھا ناگ راجہ کے تاج پر جا پڑا۔ ناگ راجہ کے جسم میں زوردار حرکت ہوئی اور وہ ترپنے لگا۔ شامو نے دیکھا کہ وہ اپنے سر کو بار بار زمین پر پٹک رہا تھا تاکہ منکا اس کے تاج سے گر جائے۔ اتر جائے۔ لیکن منکا تو اس کے تاج میں جم کر رہ گیا تھا۔ پھر ناگ راجہ سر زمین پر مٹکتے مٹکتے بے سدھ ہو گیا۔ اب وہ کراہ بھی نہ سکتا تھا۔ سچ بڑے آرام سے اپنے دائرے میں پڑے تھے۔

پھر شامو نے دیکھا "ناگ راجہ کا منہ کھل گیا۔ دو تین لمحوں تک وہ ساکت رہا۔ پھر اپنا سر اس نے تین بار زمین پر بڑے زور سے مارا۔ تیسری مرتبہ زمین پر جب اس نے سر مارا تو ایک چمکدار نئے اس کے منہ سے باہر آ پڑی۔۔۔ پھر وہ بالکل ساکت ہو گیا۔

اودھ چاند کی چاندنی کم ہو رہی تھی۔ شامو نے بین ہونٹوں سے ہٹائی۔ تھوڑی دیر بعد منکا اس کے تاج پر سے اتر کر دوبارہ شامو کے گلے میں آگیا اور بار میں پڑ دیا گیا۔ شامو نے دیکھا کہ سچ آہستہ سے اڑے اور ناگ راجہ کے منہ سے نکلے ہوئے نٹکے سے چٹ گئے۔ پھر وہ اسے اپنی قید میں لے کر اڑتے ہوئے شامو کے پاس آ گئے۔ شامو نے جلدی سے منکا قابو میں کیا اور سچ زمین پر گر پڑے۔

شامو نے منکا اٹھا کر اس کا رخ چاند کی طرف کیا اور بڑے غور سے اس میں دیکھنے لگا۔ نٹکے میں ناگ راجہ کے تاج کی ہلکی سی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ سبز رنگ کا تاج اور دو دھیا رنگ کا منکا، جس میں ہلکی سی نیلا ہٹ اور سبزی کا کالا جلا رنگ تھا۔

پالہ تم نے لے لیا تھا۔“

”ہاں بھئی۔“

”وہ پالہ کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“

”آج سے میں اسی پالے میں دودھ پیوں گی بابا بلکہ ابھی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

سردار نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے خادم کو اپنے جھوپڑے میں بھیجا اور وہ وہی لکڑی کا ڈبہ لے آیا۔ سردار نے ڈبہ کھولا۔ اس میں سے پالہ نکلا اور شامی کو دے دیا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے پالے کو دیکھا۔ دودھ اس میں اٹھلا اور ہلکی گئی۔ دودھ ہل کر اس نے پالہ چھوڑے پر رکھ دیا۔

سردار نے اسے لینے کو کہا۔ وہ بالکل سیدھی بستر پر لیٹ گئی۔ سردار نے کوئے میں پڑا ہوا صندوق کھولا۔ اس میں اوپر نیچے بہت سی شیشیاں پڑی تھیں۔ چھوٹی بڑی جن میں سفوف بھی تھے سیال بھی۔

اس نے ایک چھوٹی شیشی اٹھائی۔ شامی کے قریب آکر اس نے شیشی کھولی اور سلائی پر کچھ سیال لے کر اس کی دونوں آنکھوں میں ڈال دیا۔ جلدی سے شیشی ایک طرف رکھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ شامی مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ آنکھوں کی تکلیف بدستور گئی۔ پھر پانی پنے لگا اور سردار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ آنکھوں سے پنے والے پانی میں زردی کے ساتھ ساتھ سفیدی بھی تھی اور یہی سفیدی اس کے عمل کی کامیابی کا ایک اور ذریعہ تھا۔ شامی کی کراہیں بلند ہوتی گئیں۔ پانی اس کے گالوں پر بہتا رہا اور جہاں جہاں وہ پانی لگا وہاں وہاں اسے شدید جلن کا احساس ہوا جیسے پانی کو جہنم کی بجلی سے نکالا گیا ہو۔ سردار کے اشارے پر ایک خادمہ اس کے رخساروں پر سے پانی صاف کرتی رہی۔ پھر پانی بہتا بند ہو گیا۔ سردار نے آہستہ سے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور صندوق سے ایک دوسری شیشی نکال کر اس میں سے تھوڑا سا سفوف نکال کر شامی کے گالوں پر

روک کر بولا۔ سردار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شامو اسے تعظیم دے کر جھوپڑے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھے سردار کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

شامو شامی کے جھوپڑے کے دروازے کے آگے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ وہ مکش میں پڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلا ہوا جھوپڑے کی پشت پر آگیا۔ اس نے جھوپڑے کے سوراخ سے اندر جھانکا۔ شامی بالکل چپ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹی تھی۔ شامو سو رہی تھی۔ شامو نے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”شامی بے آرام ہو گی۔“ اس نے سوچا اور اس کے قدم اپنے جھوپڑے کی طرف بڑھ گئے لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ شامی سو نہیں رہی تھی یادوں کے سمندر میں گم تھی۔

شامو اپنے جھوپڑے کی طرف گیا اور سردار شامی کے جھوپڑے میں داخل ہوا۔ ”شامی بھئی۔“

اس نے چوہک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا --- وہ بابو کے ساتھ دواغ ہو رہی تھی۔ بابا اسے سینے سے لگائے رو رہا تھا اور پھر شامو کا خنفسہ اس نے دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پالہ تھام لیا۔ اس کی نظروں میں وہی منظر گھوم گیا۔ شامو اس کی غضب ناک نظروں کی تاب نہ لا سکا --- پالہ اس کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گیا اور ---

سردار کی آواز اسے مامی کی راہوں سے کھینچ کر حال کی پگڈنڈی پر لے آئی۔

”بھئی۔ تمہاری دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“

”اچھا بابا۔“ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

سردار نے دودھ بھرا پالہ اس کے ہاتھوں میں دے دیا لیکن اس نے دودھ پینے کی بجائے پالہ ایک طرف رکھ دیا۔

”پلے مجھے ایک بات بتاؤ بابا۔“

”کیا بھئی۔“ وہ حیران سا بولا۔

”جیسے یا۔ ہے ناں۔ شادی پہ مجھے شامو نے ایک پالہ تحفے میں دیا تھا اور وہ



پاؤڈر کی طرح لگا دیا۔ شامی کی تکلیف بالکل ختم ہو گئی۔ اب اسے کسی قسم کی جلن نہ ہو رہی تھی اور آج سے آکھیں کھولنے میں بھی تکلیف نہ ہوئی تھی۔ سردار اسے آرام کرنے کا حکم کر باہر چلا گیا۔ اس نے آکھیں بند کر کے ذہن کو خیالوں کی دنیا میں پرواز کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

☆○☆

شامی کو آئے ہوئے پورا ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا۔ ابھی تک شامو اسے نہیں ملا تھا۔ وہ اس کے بارے میں اکثر سوچتی لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی کہ وہ کیا کرے! اسے شامو سے اپنی کی گئی زیادتیوں پر بے انتہا شرمندگی تھی۔ وہ خود کو لعن طعن کرتی۔ اب وہ تجویز کر چکی تھی کہ اگر شامو ایک دو دن اور نہ آیا تو وہ اسے بلا بھیجے گی۔ وہ اس سے اپنی ہر غلطی کی معافی مانگ لے گی لیکن بیشک کی طرح شامو اب بھی وہ اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکتی۔ کیونکہ اس کی ہمت ہی نہ پڑ رہی تھی کہ شامو کا سامنا کر سکے۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھی کہ بائیں اندر داخل ہوئی۔

”آؤ بائیں۔“ شامی نے بائیں کو اشارہ کیا اور وہ اس کے بستر کے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔

”کوہ کیا بات ہے؟“

”سردار کا حکم ہے کہ آپ سے معلوم کروں۔۔۔“ وہ رک گئی۔

”ہاں ہاں۔ کوہ۔“

”وہ۔۔۔ اچھا آپ بتائیے کہ آپ خود میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ میرا مطلب ہے کہ آپ خود میں کوئی ایسا تغیر تو نہیں محسوس کرتیں جس کی وجہ سے آپ کی طبیعت بھاری رہتی ہو اور۔۔۔“

”ہاں۔“ شامی کے چہرے پر پسینے کے قطرات چمک اٹھے۔ اس اثنا میں بائیں مکمل طور پر اس کا جائزہ لے چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سردار کے سامنے موجود تھی۔

”سردار۔ ابھی شہزادی کی گود بھرنے میں تقریباً سات ماہ باقی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔ یہ اور بھی اچھا ہے۔“ سردار نے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر بائیں کی طرف اچھال دیا۔ اس نے ہار لپک لیا۔ سردار نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور وہ تعظیم دے کر باہر نکلتی چلی گئی۔

سردار تھوڑی دیر بعد جب اپنی نشست سے اٹھا تو وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک عجیب و غریب فیصلہ۔

وہ شامی کو شوگاما مندر لے جائے گا اور وہاں اس پر عمل کرے گا۔ اپنے دیوتا کے سامنے میں وہ اپنا عمل پایہ تکمیل تک پہنچائے گا۔۔۔ یہ تھا اس کا فیصلہ۔

☆○☆

شوگاما مندر۔۔۔ ان کے دیوتا کا مندر۔۔۔ جہاں صرف سردار جا سکتا تھا۔ ان کی ہمتی کا کوئی اور آدمی نہ جا سکتا تھا۔

وہ انہی اور چوتھے کے قریب کھڑی ہو گئی اس نے مٹی کا پیالہ، شامو کا تختہ، شامو کا پیالہ اٹھایا اور دونوں کمینوں کو چوتھے پر ٹیک کر پیالے کو نظروں کے عین سامنے لے آئی۔ ہاتھوں میں پیالہ لے لے وہ غور سے اسے دیکھنے لگی، پھر پیالے کو آہستہ آہستہ آنکھوں کے سامنے کھمٹا لگی۔ پیالہ گھومتا گیا۔۔۔ تب وہ چونک پڑی۔ پیالے کا ایک حصہ اس کے سامنے تھا۔ سترے رنگ میں لکھا ہوا ”شامو“ کا لفظ اس کے سامنے تھا۔ وہ بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ کافی دیر گزر گئی۔۔۔ تب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے موجود ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور جیسے بجلی سی گر پڑی۔

پیالہ اس کے ہاتھوں سے گرا اور فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے بکھر گئے لیکن وہ تو ایک ٹک شامو کو دیکھ جاری تھی جو نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ شامو جلدی سے زمین پر جھک گیا اور ٹکڑے اکٹھے کرنے لگا۔ اچانک اس کے ہاتھوں کی حرکت رک گئی۔ اس کی نظریں ایک ٹکڑے پر جم گئیں۔ اس نے دماغ میں اٹھنے والے طوفان کو روکا اور پھر آہستہ آہستہ تمام ٹکڑے اکٹھے کرنے لگا۔ سارے ٹکڑوں کو دونوں ہاتھوں میں اکٹھا کر کے وہ کافی دیر بعد کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے نظریں اٹھا کر شامی کی طرف دیکھا۔ شامی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے

شام کی درد بھری نظریں اس کا کیچہ چیر گئی ہوں۔ اس کی پلکوں پر موتی لرز رہے تھے اور آنکھوں میں ٹھکے ہی ٹھکے تھے۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو اپنے دانتوں میں دھرتے ہی بچھڑا لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے پھڑک رہے تھے۔ وہ درد بھری نظروں سے شامی کو دیکھ جا رہا تھا جو سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پکر خراش نظریں شامی کے دل کو گھائل کر گئیں۔

”شکر یہ شہزادی۔“ شامو کے ہونٹوں سے لڑتی ہوئی آواز نکل۔ پھر وہ تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ شامی بات بنی جو پیڑے کے کھلے دروازے کو دیکھ جا رہی تھی۔

”شامو۔“ ایک سسکی ابھری اور شامی دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانچے بستر پر گر پڑی۔ اس کا کانٹا ہوا جسم اور دلی دلی سسکیاں چٹکی کھا رہی تھیں کہ وہ رو رہی تھی۔ رونے جا رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی تب۔۔۔

”شہزادی۔“ وہ چونک پڑی۔

اس نے جلدی سے چہرے کو صاف کر ڈالا۔ آنسوؤں سے بیگناہ چہرہ اور سرخ سرخ آنکھیں۔

”آؤ بابن۔“ وہ جیسے کسی کمرے کو نہیں سے بولی۔

”کیا بات ہے شہزادی!“ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں۔ تم کو۔“ کیسے آئی ہو۔“ وہ کچھ سخت لہجے میں بولی۔

بابن نے دل کی بات دہائی اور سردار کی ہدایت کی تفصیل اسے سنا دی۔

ساری بات سن کر شامی نے بابن کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لوٹ گئی۔

رات ہو گئی۔

سردار جو پیڑے میں داخل ہوا۔ اس نے دیا روشن کیا اور شامی کے بستر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

”بیٹی۔ کیا بات ہے۔ ہمارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔ خیریت تو ہے۔“ سردار نے پیار سے اس کے قریب جا کر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں باب۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ارے۔۔۔ ہمارا تو جسم چپ رہا ہے۔ شامہ بخار ہو گیا ہے اور یہ سرخ سرخ آنکھیں۔ تم شاید روتی رہی ہو۔“

”نہیں باب۔“ اس نے منہ پھیر کر کہا لیکن سردار اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر الجھن میں پڑ گیا۔

”لو۔ یہ پڑیا کھاؤ۔ ابھی کچھ دیر میں آرام آ جائے گا۔“

سردار نے کمرے سے ایک تھیلی کھول کر اس میں سے ایک پڑیا نکال کر اسے دی۔

”اور وہ پیالہ کماں ہے۔ دودھ سے کھانا۔“ سردار نے خالی چوتروہ دیکھ کر کہا۔

”پیالہ۔“ وہ چونک کر سردار کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہاں بیٹی۔ شامہ ادھر ہو۔“ سردار اس کے بستر کے سرہانے آتے ہوئے بولا۔

”نہیں باب۔ پیالہ۔۔۔ پیالہ لوٹ گیا باب۔“ اس نے ایک بار پھر اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ وہ باپ کے سامنے بھی خود پر قابو نہ پاسکی۔ آتش فشاں کا لادا بہہ نکلا تھا۔

”لوٹ گیا۔۔۔ تو اسی لئے شامو بھی۔“ وہ آہستہ سے کہتے ہوئی رک گیا اور رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں نچالے کیوں نہ آگئی تھی۔ اس نے ایک بار روتی ہوئی شامی کی طرف دیکھا اور پلٹ کر دروازے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک خاموہ دودھ کا دوسرا پیالہ لے آئی اور شامی نے روتے ہوئے پڑیا کھائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گئی۔ شامہ دوا نشہ آور تھی۔

ادھر سردار ”شامو کے پاس بیٹھا تھا۔ شامو نے پیالے کے ٹکڑوں کو چھپانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ سردار نے اسے پوچھ ہی لیا۔

”شامو ہمارا پیالہ لوٹ گیا۔“ وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔

شامو نے اپنی سرخ ہوئی ہوئی سوچی ہوئی آنکھوں سے سردار کو دیکھا۔ سردار نے سر جھکا لیا۔

”ہاں سردار۔ مٹی کا تھا تاں۔ ٹوٹ گیا۔“ وہ آہستہ سے بولا اور اس کی دکھ بھری آواز سن کر سردار کا دل بھر آیا۔  
شامو نے جواب دے کر رخ پھیر لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ سردار کچھ دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا شامو۔“ ایسے ہی تیری خبریت پوچھنے آ گیا تھا۔ چٹا ہوں۔“  
”اچھا سردار۔“ اس نے اسی طرح دوسری طرف منہ کئے ہوئے جواب دیا۔  
سردار آہستہ آہستہ چٹا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر ٹھکے ہی شامو پھل پڑا اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے دامن میں جذب ہونے لگے۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے شامو دوبارہ شاہی کے جھونپڑے میں نہ آیا ان دنوں میں سردار نے شاہی کو دودھ میں بہت سے سیال ڈال کر پلائے۔ وہ ایک پیالہ دودھ میں ہر روز دو تین شیشیوں سے کئی کئی قطرے ڈالتا اور اسے پلا دیتا۔ شاہی تڑپ تڑپ کر بے حال ہو جاتی۔ اسے بے پناہ تکلیف محسوس ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے اس کے جسم پر دھم لگا کر ان میں اٹھارے بھر دیئے گئے ہوں لیکن اسے ہر تکلیف برداشت کرنا تھی۔ پھر اس نے خود میں ایک تبدیلی محسوس کی۔ اس کی جلد بڑی ملائم، چمکیلی اور نرم ہوتی جا رہی تھی۔ جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ریشم کی کھال پر ہاتھ پھیر رہے ہوں۔

پھر ایک دن سردار نے اسے ایک عجیب بات بتائی۔ اس نے آئینہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”بہنی۔ اس میں غور سے اپنی آنکھیں دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں ان میں کیا تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔“

اس نے آئینہ لے کر خوب غور سے اس میں اپنی آنکھیں دیکھیں اور بہت دیر

بعد آئینہ ہٹایا۔

”بابا۔ میری آنکھوں میں عجیب سی --- بہت زیادہ چمک ہے، جو پہلے نہیں تھی اور نہ کبھی میں نے کسی کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔“

”ہاں بیٹی! یہ چمک صرف سانپ کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔“  
”تو کیا؟“

”نہیں بیٹی۔ ابھی کہاں۔ ابھی تو نجانے کتنے اور جان لیوا مراحل سے گزرتا ہے تجھے۔“ سردار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب ایک اور بات بتاؤں۔“  
”وہ کیا بابا!“

”میں آج تک دودھ میں تجھے جو دوائیں دیتا رہا ہوں تاں۔ وہ قطرے ڈال ڈال کر۔ اور ساتھ میں کبھی کبھی سٹوف بھی۔“  
”ہاں بابا۔“

”وہ دوائیں دنیا کے خطرناک ترین سانپوں کا زہر تھا اور وہ سٹوف ان کی جلی ہوئی کھالوں کی راکھ تھی۔“

”تو کیا؟“ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ گئیں۔  
”ہاں بیٹی۔ سٹوف میں کچھ دوائیں بھی شامل تھیں۔ وہ تمہارے جسم کو زہر جذب کرنے کے قابل بناتی تھیں۔“

”تو کیا۔۔۔ میں اتنا عمرہ زہری کھاتی رہی۔“ وہ حیرت سے بولی۔  
”ہاں بیٹی --- اور تجھے بتایا اس لئے نہیں تھا کہ جان بوجھ کر کبھی کوئی نہیں دے گا۔ اگر تجھے معلوم ہوتا تو تبھی بھی اتنی بے تکلفی سے دودھ ملا زہر نہ جیتی۔“ وہ حیرت کے مارے ٹھگ ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد سردار جانے لگا۔

”بابا۔ وہ --- شامو کئی دن سے نہیں آیا۔“ اس نے پیچھے سے آواز دی۔  
”اچھا بیٹی۔ دیکھتا ہوں۔ موجود ہوا تو بھیجتا ہوں۔“  
سردار باہر نکل گیا اور وہ آنکھیں بند کر کے آئندہ کے متعلق سوچنے لگی۔ کچھ دیر گزر گئی۔

”کیا حکم ہے شہزادی۔“ وہ ایک آواز سن کر چونک پڑی۔  
دروازے پر شامو نفرس جھکائے کھڑا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ شامو پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ چہرہ اترا ہوا جیسے کوئی دکھ اندر ہی اندر اسے

کھائے جا رہا ہو۔ ویران ویران آنکھیں۔ جیسے انہیں زندگی کی کوئی خواہش نہ ہو۔  
اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔

”آؤ شامو۔ آگے آؤ۔۔۔ اور شامو نظریں جھکائے چند قدم آگے چلا آیا۔

”میں تم سے شرمندہ ہوں شامو۔“ وہ دوسری طرف منہ کر کے بولی۔

”کس بات پر شراوی۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”انجان نہ ہو شامو۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم میری زبان سے کیوں سنتا  
ہا ہے؟“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”میں اب بھی نہیں سمجھا شراوی۔“ وہ اسی لہجے میں بولا۔

شامی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے دل پر گھونٹہ سالگا۔ وہ اسی  
طرح نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

”میری طرف دیکھو شامو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

شامو نے آہستہ سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور  
شامو نے گہرا کر رخ پھیر لیا۔

”شامو۔“

”حکم شراوی۔“

”شامو۔ میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں دکھ دیا ہے۔ مجھے سزا دو

شامو لیکن اس طرح تڑپا کر سکا سکا کر نہ مارو۔“ وہ چیخ پڑی۔

”شراوی۔“ شامو کی آواز لرز گئی۔ اس کی پلکیں میچ گئیں۔

”مجھے سزا دو شامو۔ ورنہ میں اپنی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔ مر  
جاؤں گی۔“ وہ پھر چیخی۔

”شراوی۔“ اس کی لرزتی ہوئی آواز شامی کا دل چیر گئی۔ ”تم مالک ہو اور  
میں تمہارا غلام۔ تم نے اگر کوئی زیادتی بھی کی ہے تو مجھے اس کا شکوہ نہیں۔ غلام

مالک سے گلہ کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔“

”شامو۔ یوں نشتر نہ چلاؤ۔ ویسے ہی جان سے مار ڈالو۔ میں تمہاری امانت کی  
حفاظت نہ کر سکتی۔ مجھے اس کی سزا دو۔“ وہ رو پڑی۔

”تم تو یوں غمزدہ ہو شراوی جیسے پیالہ نہیں کسی کا دل توڑ دیا ہو۔“ شامو طنزیہ  
لہجے میں بولا۔

”شامو۔“ وہ بے بسی سے سر اٹھا کر سسکی۔

”ہاں شراوی۔ پیالہ میرا ٹوٹا۔ مجھے کوئی غم نہیں۔ مٹی کا پیالہ تھا۔ ٹوٹ گیا۔  
دنیا والے تو دل جیسی انمول شے کو قدموں تلے مسل کر گزر جاتے ہیں۔“

وہ تیزی سے پٹا اور جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

”شامو۔“ شامی کی آواز جھونپڑے کی دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اس کی  
سکپاں تیز ہوتی چلی گئیں لیکن شامو جا چکا تھا۔

☆○☆

بارہ تیرہ دن گزر گئے لیکن شامو پھر شامی کے سامنے نہ آیا۔ وہ اس کا انتظار  
کرتی رہی۔

سرور نے اسے بتایا کہ اب اس کی آنکھوں کو مکمل طور پر فیر انسانی بنانے  
میں ایک اور عمل کی ضرورت ہے اور ایک دن بعد وہ یہ عمل کرنے والا تھا۔

دوسری طرف شامو ”اب زندگی سے تیزار ہو چکا تھا۔ حالانکہ شامی نے اس سے اپنی  
ہر خطا کی معافی بھی مانگی تھی اور اسے یقین ہو چکا تھا کہ شامی کے دل میں محبت کی

چنگاری سبک اٹھی ہے لیکن نبھانے کیوں جس دن سے شامی کے ہاتھوں اس کا پیالہ  
ٹوٹا تھا“ وہ دل کو ایک مستقل روگ لگا بیٹھا تھا اور یہ روگ اب اسے زندگی سے

دور لئے جا رہا تھا۔

”شامی۔“ وہ چونک پڑی۔

”انٹھو بیٹی وقت ہو گیا ہے۔“ سرور نے اسے بستر پر سے اٹھنے کو کہا۔ وہ اٹھ  
کھڑی ہوئی۔

سرور نے اس کے جسم پر ایک پنکھری کھال ڈال دی اور اسے لے کر سانپ  
گھر کی طرف چل دیا۔ اس عمل کے بعد وہ مکمل طور پر سانپ کی آنکھوں کی مالک ہو

جاتی۔ وہ دونوں سانپ گھر میں داخل ہوئے۔ سرور نے دروازہ بند کر دیا۔ رات  
کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور صرف سانپ گھر میں روشنی تھی۔ انہوں

نے جبکہ کر فیش ناگ کو تنظیم دی۔ وہ دور دور سے پھنکار کر ان کی تنظیم کی قبولیت کا اعلان کرنے لگا۔

وہ دونوں گھنٹوں کے بل بیٹھ گئے۔ سردار نے شامی کو چند الفاظ بتائے اور ان کا رد کرنے کو کہا۔ شامی نے ان الفاظ کو دہرانا شروع کر دیا اور سردار فیش ناگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے عمل میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیش ناگ اپنے بہن کو ساکت کر کے براہ راست سردار کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ سردار نچالے کیا بدیدا رہا تھا۔ ”دونا شوکا“ کے الفاظ وہ بار بار دہراتا تھا۔ پھر سردار کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ چہرہ پسینے میں جھجک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں حلقوں سے اٹھنے لگیں۔ منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھوں کی سرخی دم بدم بڑھنے لگی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے آنکھوں کی جگہ دو دیکھتے ہوئے انگارے رکھ دیئے گئے ہوں۔ پسند دھار کی صورت بننے لگا۔ شامی بدستور اپنے عمل میں مصروف تھی۔

پھر سردار دونوں ہاتھ باندھے آگے بڑھا۔ وہ چلتا ہوا ڈول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا ابھی گرا کہ گرا لیکن وہ فیش ناگ سے تقریباً دو فٹ دور جا کر بالکل تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے دونوں ہاتھ گرا دیئے۔

اب اس کے ہونٹوں کی بیڑا ہٹ تیز ہو گئی۔ سردار نے تین دفعہ ”فیش ناگ“ کا نعرہ بلند کر کے کچھ الفاظ کہے اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ فیش ناگ کا ساکت بہن لہرایا اور دوسرے ہی لمحے سردار زمین پر آ رہا۔۔۔ لیکن زمین پر گرے سے پہلے فیش ناگ اسے ہاتھ پر ڈس چکا تھا۔

کافی دیر گزر گئی۔۔۔ تب وہ بڑے سکون سے اٹھا۔ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کی پشت سے خون کی ایک پتلی کی لکیر جاری ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر شامی کی طرف بڑھا۔ شامی کو لینے کا اشارہ کر کے وہ دوڑا تو ہو کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ شامی لیٹ گئی۔ سردار نے اسے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سردار نے اپنا ہاتھ جس میں سے خون کی لکیر بہہ نکلی تھی اس کے چہرے کے

اوپر لا کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ایک آنکھ کھولی اور اس میں اس خون کے چند قطرے پٹکا دیئے۔ پھر دوسری میں بھی۔ اسی طرح اس نے دونوں آنکھوں میں خون کے قطرے پٹکا کر اسے اٹھنے کو کہا۔ شامی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اندھی ہو گئی ہو۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن اسے اندھیرے کی دھند دھار کے پار کچھ نظر نہ آیا۔

”ہا۔۔۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔“ وہ کراہ پڑی۔

”کوئی بات نہیں بیٹی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لے تو یہ خون چوس لے۔“ سردار نے ڈسا ہوا ہاتھ اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اور شامی نے اس پر لب رکھ کر اس کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ وہ بہت دیر تک چوستی رہی۔ تمام خون نگل گئی۔ لیکن وہ خون کہاں تھا۔ وہ تو زہر تھا۔ فیش ناگ کا زہر اور سردار کے جسم کا زہر۔ سردار۔۔۔ جس کے جسم پر دنیا کے زہریلے ترین سانپ کے ڈسنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اپنے جسم میں داخل شدہ سینکڑوں زہریلے سانپوں کا زہر فیش ناگ کے تازہ زہر سمیت شامی کے جسم میں داخل کر دیا تھا۔ اب شامی کے جسم میں زہری زہر تھا۔ خون کی ایک بوند بھی نہیں۔ خون نما زہر اس کے جسم کی ایک ایک رگ میں گردش کر رہا تھا۔

شامی بہت دیر تک سردار کا ہاتھ چوستی رہی۔ پھر سردار نے اسے منع کر دیا۔ شامی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ جیسے اس نے خراب دودھ پی لیا ہو۔ اس کی آنکھیں اب بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سردار نے اسے دوڑا تو بیٹھے کر بالکل سامنے نظر نہیں آئے۔ وہ دوڑا تو ہو کر بیٹھ گئی اور اپنی نظروں کو عین سامنے ساکت کر دیا۔

بہت دیر گزر گئی جب اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ بالکی سی کراہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنی نظریں سامنے سے نہ ہٹا سکی۔ پھر اسے مسلسل سختی زدوست دینی پڑی۔ برواشت کرنا پڑے۔ ہر جھٹکے پر وہ کراہ اٹھتی۔ اب اسے اپنے دماغ میں آگ سی لٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے اس کے دماغ میں انگارے بھر دیئے ہوں لیکن اب وہ لاکھ کوشش کے بعد

شائبہ تک محسوس نہ ہوا۔ بلکہ ایک نئی طاقت کا احساس ہوا۔

”ہا۔۔۔ وہ دو انگارے کیسے تھے جو۔۔۔“

”ارے بیٹی۔ وہ انگارے نہیں تھے، فیش ناگ کی آنکھیں تھیں۔ جن سے تمہاری آنکھیں دو چار ہوئیں۔“ سردار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہ۔“ وہ حیرت سے بولی اور پلٹ کر اس نے فیش ناگ کی طرف دیکھا جو پھرتا رہا تھا۔

پھر کتا ہوا اپنے بچن کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت دے رہا تھا۔ شامی کی آنکھیں بالکل شیشے کی مانند چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک عام انسانوں کی بروداشت سے باہر تھی۔ اس کی اور ایک ناگن کی آنکھوں میں کوئی فرق نہ رہا تھا لیکن وہ دوسری ناگنوں سے مختلف تھی۔ اس کے جسم میں سینکڑوں سانپوں کا زہر تھا۔ سینکڑوں ناگوں کی کھالوں کا سنوف تھا۔۔۔ پھر فیش ناگ کی آنکھوں کی کشش اس کی بصارت کا حصہ بن چکی تھی۔ سارے جسم میں سے ایسی صرف اس کی آنکھیں ہی ناگن کی آنکھوں کا روپ دھار سکی تھیں، باقی کا جسم ناگن کے روپ میں ڈھالنے کے لئے اسے ابھی کافی انتظار کرنا تھا۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔

اب اس کی خوراک صرف دودھ تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور کھانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش بھر چکی تھی۔ اب وہ ہر انسان کو نظروں سے سمور کر سکتی تھی۔ بڑے سے بڑے زہریلے سانپ کو منٹوں میں زیر کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں ناگن کی آنکھیں تھیں۔ زہریلی ناگن کی۔ وہ دنیا میں اپنی طرزی زرائی اور واحد ناگن تھی۔

☆○☆

اگلے دن صبح بائیں آنکھی۔

”کیا بات ہے بائیں!“ اس نے اس کے ٹھہر مند چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

”شہزادی۔ وہ۔۔۔ سردار کل آپ پر پھر ایک آخری عمل کرنے والا ہے۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ وہ اس کی طرف

دیکھ کر بولی۔ ”پہلے بھی کافی عمل ہوئے ہیں مجھ پر۔۔۔ ایک اور سی۔“

بھی کراہ نہ سکی۔ وہ اندر جیسے میں فرق آنکھوں سے اپنے دماغ میں شعلے اٹھنے دیکھ رہی تھی۔ پھر شعلے مدھم پڑنے لگے۔ جوں جوں شعلے مدھم پڑتے گئے، اس کی تکلیف کم ہوتی گئی۔ پھر اس کی آنکھوں کے آگے سے اندر جیسے کی موٹی چادر جھٹنے لگی لیکن اندر ختم ہونے پر بھی وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ سوائے دو دیکھنے ہوئے انگاروں کے۔ دو انگارے جن سے نفی ہوئی آج اسے اپنے دماغ کے ہر گوشے میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ جلتے گا جیسے وہ انگارے اس کے دماغ کے اندر جیسے جا رہے ہوں۔ انگاروں سے دو آگ کی لہریں نکلیں اور اس کے دماغ میں داخل ہو گئیں۔ اس کے دماغ کا ہر ذرہ جلتے لگا۔ ہر حصہ سلگنے لگا لیکن وہ ہر تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے بھی حرکت کرنے سے معذور تھی۔ بہت دیر گزر گئی۔ آگ کی دو لہریں لٹخ بہ لٹخ اپنی تیز حرکت کی چلی گئیں۔ اس کا دماغ جھٹنے کے قریب تھا، درد کی شدت سے۔ تکلیف کے احساس سے!

پھر آہستہ آہستہ آگ کی لہریں اپنی حدت کم کرنے لگیں اور کافی دیر گزرنے کے بعد ان کی حدت بالکل ختم ہو گئی۔ ان کی آج اور حرارت، سکون بخش ٹھنڈک میں بدل گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس ٹھنڈک نے بھی اسے تکلیف اور درد کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اوپر کسی نے برف کی سل رکھ دی ہو۔ ٹھنڈک۔ شاید ترین ٹھنڈک۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کا دماغ جیسے جم کر رہ گیا۔ تکلیف کے احساس نے اس کے سارے جسم کو پھوڑا بنا دیا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ احساس بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ کافی دیر بعد ان انگاروں سے نکلنے والی ٹھنڈک کی یہ روشن شعاعیں بھی ختم ہو گئیں۔ تب ان انگاروں میں بکلی سی حرکت ہوئی اور وہ لڑکھ کر زمین پر آ رہی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سانس بہت ہلکا چلنے لگا۔

سردار نے اسے آرام سے لٹا دیا اور اسے ہلے سے جکھا کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر سردار کی طرف دیکھا۔

”کیسی طبیعت ہے بیٹی۔“ سردار نے اسے ہوش میں آنا دیکھ کر پوچھا۔

”ٹھیک ہے بابا۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ اب اسے اپنے جسم میں کمزوری کا

”لیکن شہزادی۔ لگر کی بات تو ہے۔ یہ مثل سرور ”ناگ دیوتا شوگاما“ کے مندر میں کرنے والا ہے۔ وہ اسی بات پر بھند ہے۔ اس نے میری بات بھی ٹھکرا دی ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ”شوگاما مندر۔۔۔ جس میں آج تک کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ صرف سرور اور ایک بوڑھا آدمی جو رہتا بھی مندر میں ہی تھا“ اس مندر سے مکمل طور پر واقف تھے۔ مندر جنگل کے سب سے زہریلے سانپوں کی کہیں گاہ میں واقع تھا اور آج تک قطعی سے دو تین آدمی جو اوسر چلے بھی گئے تھے، وہ لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ بلکہ جب بھی کوئی ناواقف ”نادانستہ“ طور پر وہاں چلا جاتا تو ساری رات تیز ہوائیں چلتی رہتیں۔ جنگل میں کسی درخت جڑوں سے اکڑ جاتے۔ کئی مقامات پر آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے اور دور آسمانوں پر گہری سرفی نظر آتے گنتی۔ یہ اس بات کی نشانیوں تھیں کہ کوئی قسمت کا مارا ہوا مندر کے قریب جا نکلا ہے۔ پھر کوئی نہ جان سکتا کہ اس غریب کا کیا حال ہوا۔ وہ مدت دیر تک سوچوں کے صحرا میں بھٹکتی رہی۔

”شہزادی۔ کیا آپ تیار ہیں۔“ باین کے چہرے پر شامی کو سوچ میں ڈوبے دیکھ کر ہلکی سی امید کی کرن لہرائی۔ وہ شامی سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اسے خطرات کے منہ میں جانا دیکھ کر بے چین ہو گئی تھی۔

”اے۔۔۔“ وہ چونک پڑی۔ ”ہاں باین۔ میں کسی خطرے سے ڈر کر اپنی منزل سے دور نہیں جا سکتی۔“ وہ پر غم لہجے میں بولی اور باین کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے ہچکارگی سے شامی کو دیکھا اور تھوڑی دیر بعد باہر چلی گئی۔

”ازے شامو۔۔۔ تم! باین دروازے پر کسی سے ٹکرائی۔“

”کون؟“ شامی چونک پڑی۔ ”پھر ”آؤ شامو۔“ کبھی ہوئی وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامو آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر چلا آیا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے شامی سے ٹکیں۔ پھر وہ نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹو شامو۔“ شامی نے اسے اپنے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا۔ شامی کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

”کیسے آئے ہو شامو؟“ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ ”ایسے ہی شہزادی۔ سرور نے کہا تھا کہ آپ اکیلی گہرا رہی ہوں گی۔“ اور شامی کی امیدوں پر پانی بھر گیا۔ تو کیا وہ اپنی مرضی سے نہیں آیا؟ سرور کے حکم پر اس کی تنہائی دور کر کے آیا ہے۔ وہ افسردہ سی ہو گئی۔

”تو تم۔۔۔ اپنی مرضی سے نہیں آئے شامو۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”اپنی مرضی؟“ وہ آہستہ سے کہہ کر مسکرا پڑا۔ ”نہیں شہزادی۔ میں نے جو بھی کام اپنی مرضی سے کرنا چاہا، وہ کبھی مکمل نہیں ہوا۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”تو شامو۔ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔“ وہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

”شہزادی۔“ وہ کھڑا ہو گیا اور کرپہ بندے ہوئے خنجر پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”میں نے اس دن بھی آپ سے کہا تھا کہ غلام اور ناگ میں کیا ناراضگی ہو سکتی ہے۔ پھر غلام کو شکوہ کرنے کا حق بھی کیا ہے۔“

”شامو۔“ وہ اس کی طرف بٹٹی۔ ”میری طرف دیکھو۔“

شامو نے دیکھا اور اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا دل اچھل کر طلق میں آ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بت کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی شامی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”شہزادی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”دیکھو شامو۔ تمہاری شامی ہاتھ باندھے تمہارے سامنے کھڑی ہے اسے معاف کر دو۔ اسے معاف کر دو شامو۔ ورنہ وہ اپنی جان دے دے گی۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لہریز ہو گئیں۔

”میری شامی۔“ وہ دھڑکے سے بڑبڑایا۔

”ہاں شامو۔ تمہاری شامی۔۔۔ کہہ دو کہ تم نے اسے معاف کیا۔ کہہ دو شامو۔“

وہ آگے بڑھ کر اس کے قدموں پر جھک گئی۔

”شہزادی۔“ وہ لرز کر رہ گیا۔



کافی دیر گزر گئی۔ تب شامی نے آہستہ سے شامو کے شالے پر سے سر اٹھایا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور شامو کے جسم میں بجلیاں سی کوئٹھ گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا رہے۔ شامی نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور شامو کا ذہن شامی کی آنکھوں کے پیغام کو پڑھنے لگا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے اپنی نظروں کو ہٹانے کی کوشش ہی نہ کی۔ وہ شامی کے ذہن کی آواز صاف طور پر سن رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شامی آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے باتیں کر رہی ہو۔ اس نے صاف طور پر سنا تھا۔

”شامو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔ میں تمہاری ہوں اور تم میرے ہو شامو۔“ اور اس کا رواں خوشی سے کانپ اٹھا۔

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جا لے کب تک باتیں کرتے رہے۔ پھر شامو کو ایسا محسوس ہوا جیسے آہستہ آہستہ اس کے جسم کی طاقت ختم ہو رہی ہو۔ شامی کی آنکھوں سے نکلنے والی برقی رد کی لہریں دھیمی پڑنے لگی تھیں۔ شامی نے اپنی آنکھیں پر سے ہٹائی تھیں۔ شامو اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

”یہ کیا ہے شامی!“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”یہ۔“ وہ مسکرا پڑی اور شامو کو بہت حسین معلوم ہوئی۔ جیسے کلیاں مکمل اٹھی ہوں۔ ”میری آنکھیں ناگن کی آنکھیں بن چکی ہیں شامو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اوہ۔“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”جی میں سوچ رہا تھا کہ یہ کشش تو صرف سانپ کا خاصہ ہے۔“

”لیکن شامو۔ تجھ پر تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا حالانکہ عام انسان میری ایک نظریں تاب نہیں لاسکتا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں شامی۔ مجھ پر کسی بھی ناگ کی آنکھوں کی اس پوشیدہ طاقت کا اثر نہیں ہو سکتا۔“

”وہ کیوں؟“ وہ دلچسپی سے بولی۔

”جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گے تب تک میں یہ قدم نہیں چھوڑوں گی۔ ان قدموں میں میری زندگی ہے شامو۔ ان کی دھول کو میری ناگ کا سینہ در بنا دو۔ کہہ دو کہ تم نے شامی کی ہر خطا معاف کر دی۔ کہہ دو شامو۔“

وہ اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

”شامی۔“ شامو کی آنکھوں سے سچے موتیوں کی لڑیاں لوٹ کر نکھر گئیں۔

”شامو تم نے۔۔۔“ اس نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔

”شامی۔“ وہ اتنی ہی کہہ سکا۔

”شامو۔“ وہ سسک پڑی۔ ”تو کتنا عظیم ہے شامو۔ میں تیری محبت کی بلند یوں کو چھو بھی نہیں سکتی۔“

”شامی۔“ اس نے جبکہ کر اسے شانوں سے تمام لیا۔ شامی نے اس کی طرف دیکھا اور شامو نے اسے آہستہ سے کھڑا کر دیا۔ پھر بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کے چوڑے سینے میں سامی گئی۔

”شامی۔“

”شامو۔“

دو سسکیاں اٹھیں اور ان کے آنسو ایک دوسرے کے سینے کی آگ کو بجائے لگے۔ خوشی کے آنسو۔

تھوڑی دیر بعد شامی آہستہ سے اس کے سینے سے علیحدہ ہو گئی۔ شامو نے اس کی آنکھیں پونچھ دیں۔ وہ مسکرا کر پھر اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ شامو نے خود کو سرور الفت میں غرق ہوا ہوا محسوس کیا۔ اس نے زور سے اسے پیچ لیا۔

وہ اپنے ہر دکھ درد، غم کو بھول گئے۔ محبت کی یہ گھڑیاں طویل ہو گئیں۔ وہ نچالے کب تک اسی طرح دل اور دھڑکن کے مصداق اپنے اپنے کمرے رہے۔ شامو نے اپنے ہونٹ شامی کی سیاہ لائنی گھٹکتور گنا ایسی زلفوں پر جمادے اور دونوں محبت کی پرسکون دنیا میں گم ہو گئے۔ شامی کا جی چاہا کہ کاش وہ زندگی بھر اسی طرح بھول اور خوشی کی ذندہ مثال بن کر کمرے رہیں اور شامو سوچ رہا تھا کہ کاش محبت کے یہ حسین لمحے طویل تر ہو جائیں اور اسی طرح کمرے کمرے زندگی تمام ہو جائے۔

”اس لئے کہ میں نے ناگ راجہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آدمی رات گزار دی تھی، جب میں تمہارے لئے مٹکا پینے گیا تھا۔ اب میری آنکھوں میں انہی آنکھوں کی کشش موجود ہے۔“

”ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔ ”شامو مجھے بتاؤ تم نے ناگ راجہ کا مٹکا کیسے حاصل کیا تھا؟“

اور شامو اسے اس خوفناک رات کا وہ شہنشاہ کا واقعہ سنانے لگا۔

”کتنا خطرناک کام تھا۔“ سارا واقعہ سن کر شامی نے کہا۔

”شامی۔ اگر تمہارے لئے مجھے جان بھی دینی پڑی تو تمہاری قسم، شامو انکار نہیں کرے گا۔ خود اپنے ہاتھوں سے موت کو سینے سے لگا لے گا۔“ اور شامی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسا نہ کو شامو۔ اب تو تم میری زندگی ہو۔“

”اچھا۔ اب میں چلوں۔“ شامو نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شامی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لے۔

”شامو۔ رات کو آؤ گے ناں۔ بابا آج رات مجھے شوگاما مندر لے جا رہا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”شوگاما مندر۔ وہاں کیوں؟“ وہ سوالیہ لہجے میں بولا۔

”بابا مجھ پر کوئی عمل کرنے والا ہے۔“ شامی شرم کے مارے تفصیل نہ بتا سکی۔

”تو تم واپس کب آؤ گی؟“ وہ افسردہ سا ہو گیا۔

”یہ تو بابا جانے۔ جانے کب کام ختم ہو۔“ شامی نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔

”اچھا شامی۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ اس سے الگ ہو کر بولا۔ پھر وہ اس کا ہاتھ دبا کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ شامی کچھ نہ سمجھ سکی۔

☆○☆

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ شامو سر جھکائے اندر داخل ہوا۔

”کیا بات ہے شامو۔ کہاں گئے تھے۔“ شامی اسے غمزہ دیکھ کر جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔

”میں۔۔۔۔۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں سردار کے پاس گیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ۔۔۔ اپنی شامی کے ساتھ مندر میں لے جائے اور۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا اور اپنی انگلیاں مروڑنے لگا۔

”ہاں بھر۔۔۔ کیا کہا بابا۔۔۔“ شامی بے چین ہو گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شامو کی حالت بتا رہی تھی کہ سردار نے انکار کر دیا ہے۔

”اور سردار نے اجازت دے دی۔“ وہ یکایک سر اٹھا کر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”اوہ۔“ شامی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے غصے سے شامو کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں سے محبت کے جھٹسے اہل رہے تھے۔ غصے میں پیار بھری ناراضگی میں وہ کچھ اور بھی حسین معلوم ہونے لگی تھی۔

”جاؤ۔ میں تم سے نہیں بولتی۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

”دیکھو بھئی۔ میں اتنی مشکل سے سردار سے اجازت لے کر آیا ہوں اور تم الٹا ناراض ہو رہی ہو۔“ وہ اس کے قریب آکر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

اس نے آہستہ سے شامی کا رخ اپنی طرف پھیرا۔ ”ناراض ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

”ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی سردار سے جا کر کہے جاتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھا اور شامی نے اس کے خطرناک تیور دیکھتے ہی بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ وہ ہنسا ہوا اس کی طرف پلٹا۔ ”اب تو ناراض نہیں ناں۔“ وہ پیار سے بولا۔ اور شامی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دونوں مسکرا دیے۔

پھر شامو چلا گیا۔ ایک عرصے کے بعد آج اس کے چہرے پر زندگی کروٹیں لے

دی تھی۔

☆☆☆

رات کا پہلا پھر تھا۔ شامو، شامی، سردار، دو خادم اور باہن مندر کے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ سب سے آگے سردار اور باہن ان کے پیچھے دو لون خادم ایک بہت بڑا صندوق اٹھائے ہوئے تھے جس میں سردار نے بجائے کیا والا بلا بھر رکھا تھا کہ دو لون خادم بٹے کئے ہوئے کے باوجود اسے بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھے اور سب سے پیچھے شامی اور شامو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

وہ بڑا رقت مہاں تک پہنچے تھے۔ راستے میں خطرناک اور خوفناک سانپوں کے علاقے سے گزرتے ہوئے وہ کئی دفعہ مرے مرے پیچے۔ شامو نے ایک بہت بڑا پتھر کندھے پر ڈال رکھا تھا جس میں کئی بڑے بڑے سانپوں کے ٹوکے تھے۔ سردار اپنے ہاتھ میں دو بکوں کی رسیاں تھامے ہوئے تھا اور باہن ایک بڑے تھیلے میں تین نیولے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔

شامو خوش تھا۔ بہت خوش۔ جیسے اسے سارے جہاں کا خزانہ مل گیا ہو۔ شامی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ زمین کی سات تلوں کے خزانے اس کے آگے پیچھے تھے۔ خطرناک دلدلوں کو پار کرتے، خوفناک درندوں سے بچتے بچتے وہ چلے رہے۔ زمین پر سانپ کیڑوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ اپنی سرخ زبیاں نکالے پھنکارتے پھر رہے تھے۔ درختوں پر ان کے چاروں طرف ہر سو سانپ ہی سانپ تھے لیکن فہمائے کیں ان کو دیکھتے ہی وہ ادھر ادھر بھاگنے لگتے۔ ان کے نزدیک آنے سے گھبراتے۔ راستہ بہت تاریک، دشوار گزار اور خطرات سے اٹا پڑا تھا لیکن سردار اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے یہ راستہ اس کا جانا پہچانا ہو اور یہ صحیح بھی تھا۔ وہ ”شوگاما“ کا خاص بچاری تھا۔ سب سے بڑا بچاری!۔۔۔ شامی اور شامو اپنی محبت کے نشے میں سرشار ہر مشکل کو ختمہ پیشانی سے ٹالے جا رہے تھے۔ سردار نے راستے میں ایک ذرا سادھی آرام نہ کیا تھا۔ وہ مسلسل چل رہا تھا اور جوں جوں منزل نزدیک آ رہی تھی اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔

ہر طرف اندھیرے کی عکرائی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھانکی نہ دیتا تھا۔ لیکن ایسا لگتا

تھا جیسے ان کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہیں۔ اسی طرح چلتے چلتے وہ مندر تک جالے والی پگڈنڈی پر پہنچ کر رک گئے۔

بالکل سیدھی پگڈنڈی جس کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت اور گنجان جمائیاں بالکل خاموش کھڑی تھیں۔ چاند پیکا پیکا چکا تھا اور اس کی ہلکی ہلکی زرد چاندنی ایک خوفناک ساں بانڈھ رہی تھی۔ وہ بڑوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ سردار سب سے آگے دو لون ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا جیسے وہ کسی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے لگا ہو۔ ایک خوفناک منظر تھا۔ دو لون میں دہشت پیدا کر رہا تھا۔ ان کے ذہنوں پر عجیب خوابناک سی کیفیت تسلط جاری تھی۔ ان کے جھون میں سردار درد کی ملی جلی لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ عجیب سی حالت میں کھڑے بالکل سامنے دیکھ رہے تھے۔ پگڈنڈی بالکل سیدھی جا رہی تھی۔۔۔ اور اس کے خاتمے پر ”شوگاما مندر“ بڑے غور سے سراٹھائے کھڑا تھا۔

فضا سائے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مندر سیاہ پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف سیاہ گھاس اُٹی ہوئی تھی۔ لمبی لمبی سیاہ گھاس جو سانپوں کی طرح چھین اٹھائے کھڑی تھی۔ ان پر ایک سحر کا عالم طاری تھا اور آنکھیں دور مندر پر جمی ہوئی تھیں۔

سردار نے دو لون ہاتھ پھیلا دیئے اور اس کی آنکھیں چاند کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، جیسے دو دھکتے ہوئے کونکے۔ جیسے اس کی آنکھوں میں شیطانی جل اٹھی ہوں۔ وہ ایک تک چاند کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ ایک بدلی میں چھپ رہا تھا۔ پھر وہ ایک سیاہ بدلی میں کم ہو گیا۔ فضا اور بھی خوفناک ہو گئی۔ سکوت کی چادر اور بھی گہری ہو گئی۔ جو خفی فضا مکمل اندھیرے میں ڈوبی سردار نے زرد دار آواز میں ایک نعرہ بلند کیا۔

”شوگاما“

اس کی پہلی ہوئی دہشتناک آواز سن کر سب کے دل دھل گئے۔ سردار کی آواز فضا میں گونجتی رہی۔ جیسے ان کے چاروں طرف ایک ناپیدہ دیوار موجود ہو جس کی دیواروں سے گھرا کر آواز کی بازگشت بہت دیر تک لہرائی رہی۔

کھڑے تھے۔ ان کی پلکیں نہ جھپک رہی تھیں۔ دیران آنکھیں سامنے جی ہوئی تھیں۔ اب سردار کے منہ سے خوفناک آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ بے بہم آوازیں۔ جھنجھیں۔ کراہیں۔ غراہیں۔ وہ ناچتا رہا۔ ناچتا رہا۔ ہوائیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ درخت اپنی جگہ سے اکھڑتے نظر آئے گئے۔ جھاڑیاں ہوائیں اڑتی نظر آئے لگیں لیکن نہ تو کوئی درخت اکھڑا نہ جھاڑی گری۔ ہاں سردار کا رقص ضرور ہوا کی تیزی کے ساتھ عروج پر پہنچ گیا۔ سردار زمین سے دودھنٹا اچھل رہا تھا۔ گرتا، اٹھتا اور پھر تپتے لگتا۔ اس کی خوفناک آوازیں فضا کو اور بھی دہشتناک بنا رہی تھیں۔ کبھی یوں لگتا جیسے بیڑیا رو رہا ہو اور کبھی یوں لگتا جیسے کوئی وحشی قہقہے لگا رہا ہو۔ کبھی وہ جھنجھیں مارنے لگتا۔ کبھی درو بھرے انداز میں کراہنے لگتا اور کبھی وہ درندوں کی طرح غرائے لگتا۔

بمست دیر گزر گئی۔ سردار کے دھیانہ رقص میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ فضا میں مرکزِ اکاہٹ کی آواز بمست زیادہ بڑھ چکی تھی۔ بھر بھر سردار نے ایک زوردار جھج کے ساتھ دونوں ہاتھ مندر کی طرف اٹھا کر ”شوگاما“ کا نعرہ بلند کیا تو بجلی زور سے لہرائی اور ایک لمحے کے لئے ساری فضا روشن ہو گئی۔ اب ”شوگاما“ کے نعرے مسلسل بلند ہونے لگے اور ہر بار بجلی پہلے سے زیادہ خوفناک انداز میں کڑکتی۔ اس کی چمک آنکھوں کو بے نور کرنے کے لئے کافی تھی لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح بے جان مردوں کی طرح کھڑے تھے۔

آخری بار سردار کے منہ سے ایک کمرہ جھج ”شوگاما“ کی آواز کے ساتھ نکلی۔ فضا میں زوردار مرکزِ اکاہٹ کی کان پھاڑ آوازیں سنائی دیں۔ ہوائیں ہلاؤں کی طرح جھنجھیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ، شاخیں شاخیں کی خوفناک آوازیں میں بدل گئی۔ بجلی زور زور سے کڑکنے لگی اور اب آسمان پر چمکنے والی بجلی سانپ کی طرح لہرائے لگی۔ جب بجلی چمکتی تو آسمان پر لہرائے ہوئے تاب کے شکل میں جاتی۔ پھر بجائے کہاں کہاں بجے لگی گری کہ جنگل میں بمست سے مقامات پر شعلے بھڑک اٹھے۔ ہلاؤں کی طرح جھنجھتی ہوئی ہوائیں۔ بجلی کی کڑکڑاہٹ۔ ہلاؤں کی کڑکڑاہٹ۔ ایک خوفناک مہر تھا لیکن ان پر کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔ سردار

سردار نے دوسری بار پھر نعرہ بلند کیا اور فضا میں مرکزِ اکاہٹ کی آواز گونج اٹھی جیسے ہادل گرے ہوں۔ سردار نے زور زور سے کچھ بڑبڑاتا شروع کیا۔ اس کی آواز اس سائے میں عجیب لگ رہی تھی۔ وہ نچائے کس زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ فضا میں مرکزِ اکاہٹ بڑھتی گئی اور ساتھ ہی سردار کی آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ مندر پر نظریں جمائے اپنے کام میں مگن رہا اور سب لوگ جڑ کے جڑوں کی طرح اپنی جگہ پر جمے سامنے نظریں جمائے کھڑے رہے۔ چاہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کی جانب نہ دیکھ سکے۔ شامی کا ہاتھ اب بھی شامو کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ مجنوں کی طرح ساکت تھے۔ جیسے کسی نے ان کو جادو کے زور سے پھرتا دیا ہو۔ سردار کافی دیر تک ادھنی آوازیں سننے سے پڑتا رہا۔ وہ بالکل نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے تیسری مرتبہ ”شوگاما“ کا نعرہ بلند کیا۔

فضا میں بجلی کڑکی اور سردار جھجے میں گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی تمام لوگ اس طرح جھجے میں گر پڑے جیسے ان کو اس پر اختیار نہ ہو۔ غیر ارادی طور پر کسی کے حکم پر وہ جھجے میں گر پڑے ہوں۔ سب لوگ جھجے میں جمے ہوئے تھے کہ اچانک ان کو محسوس ہوا جیسے طوفان آگیا ہو۔ ہوا تیز چلنے لگی تھی۔ درخت اور جھاڑیاں زور زور سے ہلنے لگیں۔ درخت جیسے ابھی گر پڑیں گے۔ جھاڑیاں جیسے ابھی اپنی جگہ چھوڑ دیں گی لیکن عجیب بات تھی کہ پکڑ پکڑی پر سے دھول کا ایک ذرہ نہ اڑا تھا۔ خوفناک اندھیرے میں ہوائی کی سرسراہٹ ایک دہشتناک سانس پیدا کر رہی تھی۔

پھر سردار اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سب بھی بالکل سحر کے عالم میں اٹھ گئے۔ سردار کے سر کے بال بکھر گئے تھے۔ آنکھیں بالکل دیران، زندگی کی رونق سے محروم ہو گئی تھیں۔ لگے کی رکیں ابھر آئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے۔ جڑے بچھنے لگے تھے اور جسم کا ایک ایک رداں کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اچانک گھوما اور پھر۔۔۔ ایک دھیانہ رقص شروع ہو گیا۔

سردار ناچ رہا تھا۔۔۔ بے خود ہو کر۔ خود سے بے خبر۔ بے بہم سی اچھل کود لیکن اس اچھل کود کو عام انسان دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ بمست خوفناک منظر تھا جو دل کو دھڑکن سے محروم کر دیتا۔ سردار رقص کر رہا تھا۔ وہ سب چپ چاپ



ہوئی سیاہ گھاس بٹنے لگی تھی، جیسے سانپ بچن اٹھائے لہرا رہے ہوں۔ ان کا استقبال کر رہے ہوں۔ سردار نے جبکہ کر تعظیم دی اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دونوں بازوؤں کے سامنے میں شامو اور شامی کو لے لیا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں خادم بڑا صندوق اٹھائے ہوئے تھے اور سب سے پیچھے بائیں نیولوں والا تھمبلا اٹھائے چلی آ رہی تھی۔

جب وہ سب اندر داخل ہو گئے تو سیاہ گھاس کی پٹنگاریں رک گئیں۔ اس کی حرکت ختم مٹی اور دروازہ بے آواز بند ہو گیا۔ فضا پر ایک مرتبہ پھر سانسے کی سکرانی ہو گئی۔ بے کراں سناٹا --- جس سے ہزاروں طوفان جنم لیتے ہیں اور ہزاروں ہنگامے پرورش پاتے ہیں۔

☆○☆

”شامی۔“ سردار نے آہستہ سے اس کا شانہ ہلایا اور وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ شامو بھی سردار کی آواز سن کر جاگ گیا تھا۔

”جہل بیٹی وقت ہو چکا ہے۔“ سردار نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ ہنسنے لڑ پڑی۔ بستر کیا تھا۔ پھر کے چوتھے پر ریشم کی کھالیں ڈالی گئی تھیں۔

آج ان کو مندر میں آنے پورے چار دن ہو گئے تھے۔ مندر کا بوڑھا پجاری شامان سردار کو بھیجتے ہی رکوع کی حالت میں جبکہ گیا تھا۔ پھر سردار کے اشارے پر ہی سیدھا ہوا۔

بوڑھے پجاری کا جسم نہایت لاغر اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں بے پناہ ہنک تھی۔ جسم کی ایک ایک ہڈی مٹی جاسکتی تھی۔ لمبی لمبی انگلیاں اور طوٹے کی طرح باہر کو نکلی ہوئی چونچ جیسی ناک۔ ہال لٹوں کی طرح بہت لمبے لمبے تھے اور چہرے پر بمبوؤں، پلگوں، مونچھوں یا داڑھی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بالکل مضافت چہرے کی جلد اٹھنے کے جھٹکے کی طرح لٹام تھی۔ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ کمزور جسم کے مقابلے میں اس کی آواز بڑی پائنت دار تھی اور اس میں عجیب سی کڑختلی اور دروغی تھی۔ بوڑھے نے کسی قسم کی پوچھ سمجھ کے بغیر ان کو دو کرے دے دیئے جو ہر قسم کی اشیاء سے پاک تھے۔ صرف ایک چوترا تھا جس پر

ریشم کی کھالیں ڈال کر اس سے بستر کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی چیز نہ تھی۔ کمرے کا فرش، دیواریں، چھت سب کچھ سانپوں کی بڑی بڑی خوفناک تصویروں سے اُٹے پڑے تھے۔ یہ تصویریں کس نے بنائیں، یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ نہ ہی کسی نے پوچھے کی کوشش کی۔ کمرے کا دروازہ ایک چوکور سا خلا تھا جسے بند کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔

سردار نے ان کو ایک ترتیب سے فہرا دیا۔ بائیں اور شامی ایک کمرے میں اور دوسرے کمرے میں دونوں خادم اور شامو ٹھہرے۔ بوڑھے نے دونوں کمروں کے فرش پر بھی سردار کے حکم کے مطابق کھالیں بچھا دیں۔

چار دن تک انہوں نے کوئی کام نہ کیا۔ شامی سارا دن شامو کے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ دونوں بے مٹی، بے سروپا، عجیب عجیب باتیں کرتے رہتے۔ ان چار دنوں میں سردار صرف تھوڑی دیر کے لئے ان کو لے آتا رہا، پھر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا۔ شامی نے اس سے پوچھا بھی لیکن وہ جواب میں صرف مسکراتا رہا۔

پھر شامی یا اور کسی نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ ان چار دنوں میں وہ اپنے کمروں کے علاوہ کہیں نہ گئے۔ سردار صندوق، نیولوں والا تھمبلا اور دونوں کمرے بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان دنوں میں ان کو کھانے میں دودھ اور گوشت کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ بوڑھا ان کو مٹی کے بڑے بڑے پیالوں میں بھنا ہوا گوشت اور دودھ دے جاتا۔ شامی تو صرف دودھ پیتی تھی۔ گوشت دوسرے افراد کھاتے تھے۔

اور آج ---

سردار نے سوئی ہوئی شامی کو آجگیا۔ شامو اور شامی کو لے کر سردار ایک تنگ و تاریک راستے پر چل پڑا۔ سرگرم نمرا راستہ تھا لیکن وہاں ٹھنکن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ وہ کافی دیر تک چلتے رہے۔ پھر راستہ بند ہو گیا۔ آگے سپاٹ دیوار تھی۔ سردار نے رک کر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ کچھ بوڑھیا اور دیوار پھٹ گئی۔ راستہ بن گیا۔ وہ سردار کے پیچھے چلتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ دیوار پھر برابر ہو گئی۔ سردار نے ہاتھ اٹھا کر ان کو روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گئے۔ سردار کے دائیں طرف شامی اور بائیں طرف شامو حیرت کے عالم میں کھڑے سامنے دیکھ رہے تھے۔

ان کے ذہن سوچنا بھول گئے۔ دل کی دھڑکن مدھم مدھم پڑ گئی۔ سانس بوجھل ہو گئی اور آنکھیں جھپکنے کی طاقت کھو بیٹھیں۔ ان کے سامنے ایک ایسا ہی منظر تھا۔ وہ ناگ دیوتا شوگاما کے مندر کے ہال کمرے میں کھڑے تھے۔

ہال بہت بڑا تھا۔ ان کے دائیں بائیں، سامنے، پیچھے، ہر طرف بڑے چھوٹے سانپ کڈلی مارے بیٹھے تھے۔ ان کے چمن جگے ہوئے تھے جیسے وہ کسی کی تعظیم کے لئے گردنیں جھکا کر بیٹھے ہوں۔ ان کی سرخ سرخ زبانیں بار بار منہ سے لپکتیں۔ پتھاریں گونجتیں لیکن چمن اپنی جگہ پر ساکت تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کی عادت میں مصروف ہوں۔ کئی ناگ جب زبان باہر نکالتے تو زمین پر زہر کے قطرے کرتے۔ آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے۔ جیسے ان کے زہر میں آگ ہی آگ ہو لیکن جب یہ آگ سرد ہوتی تو فرش کا وہ حصہ جس پر زہر گرنا بالکل سیاہ پڑ چکا ہوتا۔ پھر وہاں زہر کے قطروں کی بجائے سرخ رنگ کے موتی نظر آتے۔ ہال میں ہر طرف یہی موتی نظر آ رہے تھے۔ یہ موتی جن کو باہر کی دنیا میں سانپ کا من کہتے ہیں اور جو ایک سانپ میں صرف ایک ہوتا ہے، لیکن ان کے ہر قطرے میں ایک من پوشیدہ تھا۔ دنیا کے زہریلے ترین ناگ جو دنیا کے کسی بھی حصے میں نہیں ہیں اس مندر میں شوگاما دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ ہال کی چھت پر بھی ان مکت سانپ لٹک رہے تھے۔ ان کی سرخ زبانیں تیزی سے اندر باہر آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں اور سانپوں کی اس وادی میں جہاں پاؤں بھی سانپوں پر رکھ کر گزرنے پڑتا تھا، سردار، شامی اور شامو کھڑے تھے۔

سردار نے آہستہ سے ان دونوں کی طرف گردن جھکا کر باری باری دیکھا اور اپنا قدم آگے بڑھا دیا۔ شامو اور شامی چونکے اور ان کے قدم بھی حرکت میں آ گئے۔ سردار پاؤں ایک سانپ کے اوپر پڑا جس کا چمن جھکا ہوا تھا اور وہ زمین سے تقریباً ایک فٹ بلند تھا۔ سردار نے دوسرا پاؤں دوسرے سانپ پر رکھ دیا اور شامی اور شامو کو بھی اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور سردار کی تقلید کرتے ہوئے انہوں نے بھی دو سانپوں پر اسنے پاؤں ٹکا دیئے۔ سردار نے کچھ بڑبڑا کر سرخم کر کے پھونک ماری اور سانپ اس کی دونوں ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ شامو

نے اپنا ایک ہاتھ سردار کے بائیں شانے پر اور شامی نے دائیں شانے پر ٹکا دیا۔ تب ان کے پاؤں سے بھی دونوں سانپ لپٹ گئے۔

سردار نے بالکل سامنے دیکھا۔۔۔ "شوگاما"۔۔۔ اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ نکلی۔ ان دونوں نے بھی نظریں اوپر اٹھائیں اور ان کے دل اچھل کر ملن میں آ گئے۔ اور سانس رک گئے۔ ابھی چند لمبے پہلے تو ان کے سامنے کچھ بھی نہ تھا اور اب ان کے سامنے شوگاما کا مجسمہ موجود تھا۔

مجسمہ۔۔۔ جو ہال کی چھت سے مس ہو رہا تھا۔ شوگاما دیوتا کا مجسمہ اپنا چمن پھیلائے، اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ اس کا چمن اتنا چڑا تھا کہ اس میں کم از کم چھ آدمی سکتے تھے۔ پھر اس سے پیچھے پانچ آدمیوں کی چوڑائی کے برابر اس کا دھڑ تھا۔ جس کے بعد اس کا کڈلی مارا ہوا جسم تھا۔ اس کے پورے جسم پر پچاس سے زیادہ آدمیوں کے لئے جگہ تھی اور جہاں اس کا جسم ختم ہوتا تھا وہاں سے چترہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہ چترے پر بیٹھا تھا۔ چترہ بالکل گول تھا اور سامنے کی طرف اس پر میڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ چترے کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے ستون تھے جن میں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ شوگاما دیوتا کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکلتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دو آدمی سمٹ سنا کر بیٹھ سکتے تھے۔ اس کے سارے جسم پر برے بڑے سیاہ داغ تھے جیسے ناگ کڈلی مارے بیٹھا ہو۔ ویسے جسم کا رنگ سبزی مائل زرد تھا۔ اس کے چمن پر سر کے اوپر ایک بہت بڑا تاج رکھا تھا۔ سنرا تاج، جس سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں اور۔۔۔ اس میں مین سامنے ایک بہت بڑا من تھا۔ سفید رنگ کا من۔۔۔ جس سے دو دھوپا رنگ کی روشنی نکل رہی تھی جو سارے ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔ من میں صاف طور پر ایک ناگ کڈلی مارے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ دیوتا کی باہر نکلی ہوئی سرخ رنگ کی زبان جو اس کے سینے تک لٹک رہی تھی بہت خوفناک لگ رہی تھی۔

وہ اس منہ کی محر انگیزی میں کھو کر رہ گئے۔ ہال میں ہر طرف پھیلے ہوئے سانپوں کی پتھاریں دم کی تھیں۔ اب ہر ناگ ساکت تھا۔ سردار کی آنکھیں دیوتا



کی آنکھوں میں گڑھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ بدبواہا تھا۔ شامو اور شامی خاموش کھڑے تھے اور ان کی نظریں بھی ناگ دیوتا پر جمی ہوئی تھیں۔  
پھر سردار کی چیخ نے ان کے دل دہلا دیئے۔

”شوگا۔۔۔ شو۔۔۔ گا۔۔۔ شو۔۔۔ گا۔۔۔ گا۔۔۔“

سردار کی تین خوفناک چیخیں بلند ہوئیں اور اس کا سارا جسم کھٹج سے اکڑ گیا۔ شامو اور شامی نے اپنا ایک ایک ہاتھ سردار کے کندھوں پر بجا رکھا تھا، انہوں نے صاف محسوس کیا کہ سردار کے جسم میں پتھر کی سی سختی آگئی تھی، گوشت کی نرمی ختم ہو چکی تھی۔

پھر ایک اور مٹرے ان کو دنیا دانیسا سے بے خبر کر دیا۔

دیوتا کی دونوں آنکھوں سے روشنی کی دو لہریں نکلیں اور سردار کی آنکھوں سے آکر انہیں۔

جوئی وہ لہریں سردار کی آنکھوں میں داخل ہوئیں، سردار کا جسم پیسے پھیل گیا۔ شامی اور شامو کے ہاتھ اس کے شانوں میں دھنسنے لگے لیکن یہ احساس کر کے بھی وہ کچھ نہ کر سکے۔ کیونکہ دیوتا کے جسم کے ہر حصے سے روشنی کی لہریں نکلنے لگی تھیں۔ بالکل سیدھی، متوازی روشنی کی لہریں اور یہ لہریں ان کے جسموں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے جسموں میں بجلیاں کوند رہی ہوں۔ جیسے کوئی انہماقی طاقت ان میں طویل کرتی جا رہی ہو۔ دیوتا کے من سے نکلنے والی روشنی پہلے سے کتنا ہی بدھ چکی تھی۔ پھر ان کے قدموں سے لپٹے ہوئے سانپوں نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ وہ گہرے اودے رنگ کے سیال میں تبدیل ہو کر ان کی انگلیوں کو پنڈلیوں سے لے کر پاؤں تک ہو کر تر کر رہے تھے۔ لیکن شامی یا شامو یہ نہ جان سکے کہ جوئی ناگ دیوتا کے جسم سے نکلنے والی دو لہریں ان سانپوں سے ٹکرائی تھیں، سانپ جمی پھیل گئے تھے۔

چہرے لے اسی حالت میں گزر گئے۔ ان کو یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ پھر دیوتا کے جسم سے نکلنے والی لہروں کی روشنی کم ہونے لگی۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی روشنی بھی مدھم پڑنے لگی۔ جوں جوں روشنی واپس دیوتا کے جسم اور

اس کی آنکھوں میں سمٹی، توں توں وہ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے فرش سے تقریباً دس فٹ اوپر اٹھنے ہوئے، دیوتا کی طرف بڑھنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے روشنی ان کو اپنے ساتھ کھینچنے لے جا رہی ہو۔ پھر شامو اور شامی ایک دوسرے سے اور سردار سے بھی جدا ہو گئے۔ وہ دونوں ستونوں پر جن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، شعلوں پر، ہوا میں کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں شعلوں میں تھے اور باقی جسم باہر۔۔۔ لیکن ان کو کسی قسم کی جلن، درد یا تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ انہیں یہ سب خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ خود کو کسی محسوس جگہ پر کھڑا محسوس کر رہے تھے حالانکہ ان کو اپنے پاؤں آگ میں صاف طور پر نظر آ رہے تھے۔

وہ شعلوں پر کھڑے تھے اور سردار۔۔۔ وہ ناگ دیوتا کے قدموں میں پڑا تھا۔ اب دیوتا کی دونوں آنکھوں کی روشنی شامو اور شامی کے جسموں کا طواف کر رہی تھی۔ پھر دیوتا کی آنکھوں میں سے نکلنے والی روشنی دو قسم ہو گئی۔ شامو اور شامی نے اپنے آپ میں نئی طاقت، نیا پن محسوس کیا۔ جیسے وہ کچھ بدل گئے ہوں۔ ان کے جسم وہ نہ رہے ہوں جو تھے۔ ان کے دل، دماغ ہر حصہ جسم میں کوئی تبدیلی آ چکی ہو۔ پھر وہ آہستہ آہستہ شعلوں سے اتر کر ستونوں کے پاس بیٹھے آ گئے۔ وہ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے بیٹھے آئے تھے سردار نے جدے سے سر اٹھایا۔

اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں دیوتا کو پکارا اور دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا دیئے۔ دوسرے ہی لمحے وہاں وہ دونوں بکھرے موجود تھے جو وہ بہت سی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سردار نے ان کی طرف دیکھا اور وہ اس کی آنکھوں کی کشش کی تاب نہ لا کر، اس کا حکم ماننے ہوئے ذبح ہونے کے انداز میں اس کے آگے لیٹ گئے۔ سردار نے اپنے لیے چوٹے میں ہاتھ ڈالا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں چھری موجود تھی جس کی دھار بہت تیز تھی۔ پھر سردار کا ہاتھ حرکت میں آیا اور دونوں بکھڑوں کی گردنیں تن سے جدا ہو گئیں۔ سردار نے جلدی سے ان دونوں کے دھڑوں کو اٹھایا اور ہال کے فرش پر پھینک دیا۔ چاروں طرف سے پتھارے ہوئے سانپ ان پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ بکھڑوں کو کھانے، ان کا خون پینے کی بجائے اپنا اپنا ڈنک ان پر آزما رہے تھے۔ وہ ایک ایک بار ڈس کر پھر اپنی جگہوں پر

چلے گئے۔

جب تمام سانپ اپنا کام کر کے فارغ ہو گئے تو سردار نے دیوتا کی طرف دیکھا پھر دونوں بکڑوں کے سر اٹھا کر اوپر اچھال دیئے۔ وہ ہوا میں تھرتے ہوئے دیوتا کی زبان پر جا کر ٹھہر گئے۔ دیوتا کی زبان سے دو قطرے نکلے اور دونوں سر جلتے ہوئے نیچے سردار کے دائیں بائیں آکر گرے۔ سردار نے ان کو اٹھایا اور قرش پر پیچیک دیا۔ دونوں سراپے اپنے دھڑوں کے ساتھ جا کر جڑ گئے۔ دوسرے ہی لمحے دونوں بکڑے پھر زندہ سلامت کھڑے تھے۔

یہ سب کچھ شامو اور شامی نہ دیکھ سکے۔ وہ تو دیوتا کو گھورے جا رہے تھے۔ دیوتا نے ان کو اپنی کشش کے دائرے میں لے رکھا تھا۔ دونوں بکڑے اپنی جگہ کھڑے کھڑے غائب ہو گئے۔ سردار نے اپنی نظریں ہال سے ہٹائیں اور پھر سجدے میں چلا گیا۔ بہت دیر گزر گئی۔ پھر سردار نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھر چکے تھے۔ اس نے چمڑی اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھیں بند کر لیں 'ایک زوردار نعرہ "شوگاما" کا بلند کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ زمین سے اوپر اٹھنے لگا۔ تیزی سے --- پھر وہ دیوتا کی زبان کے قریب ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس نے تیزی سے اپنے بائیں ہاتھ کی پتلی پر چمڑی سے زخم لگایا۔ اس کے ہاتھ سے گاڑھا سرخ سرخ خون اہل پڑا۔ اس نے ہاتھ عین دیوتا کی زبان کے اوپر کر دیا۔ خون دیوتا کی زبان پر گرنے لگا۔ خون دیوتا کی زبان میں جذب ہوتا رہا اور زبان کی سرخی بڑھنے لگی 'حتیٰ کہ اس میں خون کی سرخی جھلکنے لگی۔ زندگی کی رونق دوڑنے لگی۔ سردار نے اپنے ہاتھ پر دو سرا زخم لگایا اور دو سرا فوارہ اہل پڑا۔ اس نے پھر ہاتھ زبان کے اوپر کر دیا اور زبان خون جذب کرنے لگی۔ پھر زبان میں بجلی سی حرکت ہوئی۔ سردار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے تیسرا وار اپنے ہاتھ پر کیا اور تیسرا خون کا فوارہ زبان پر گرنے لگا۔ اب زبان میں مکمل طور پر حرکت آگئی۔ زبان ادھر ادھر ایک دو بار بجلی اور اس میں سے خون کا ایک قطرہ زمین پر ٹپک پڑا۔ جو خنی قطرہ زمین پر گرا 'سردار بھی زمین پر آ رہا۔

جہاں پر قطرہ گرا تھا وہاں پر آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ دو دف قطرے

دائرے میں آگ ہی آگ تھی جس کے شعلے زمین سے تقریباً "پانچ فٹ بلند تھے۔ ان شعلوں میں ایک ناگ کنڈلی مارے بیٹھا بھٹکا رہا تھا۔ سردار نے بے خوف و خطر اندر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے ہی لمحے ناگ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ میں لے لے شامی کی طرف دیکھا جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ شامی بے تحاشہ قدم اٹھائی ہوئے اس کے قریب آگئی۔ ناگ کے جسم پر بالکل ناگ دیوتا جیسے داغ تھے۔ وہ بالکل ناگ دیوتا کی تصویر تھا۔ سردار نے شامی کو اپنے قریب بٹھالیا۔ آگ کے شعلے لمحہ بہ لمحہ بلند ہو رہے تھے۔ اس نے شامی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور شامی محسوس ہو کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ سردار کا ہاتھ آگے بڑھا۔ ناگ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ قریب --- اور قریب --- اور قریب --- اور سردار کا ہاتھ عین شامی کے ماتھے کے سامنے جا کر رک گیا۔ ناگ بھٹکا کر تڑپا اور --- شامی ایک طویل کراہ 'چیخ نما کراہ کے ساتھ دوسری طرف الٹ گئی۔ اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ اہل پڑا 'جہاں پر ناگ نے ڈسا تھا۔ سردار نے ناگ کو دوبارہ آگ میں پیچیک دیا۔ آگ اپنا حجم مزید بڑھانے لگی۔ سردار اٹھ کر پھر ناگ دیوتا کے قدموں میں چلا گیا۔ شامی آہستہ آہستہ آگ میں گم ہو گئی۔ آگ کے شعلے اس کے گرد پھیل چکے تھے۔ وہ ان میں دفن ہو کر رہ گئی۔

شامو دیر ان آنکھوں سے لمبے لمبے شعلوں کو گھور رہا تھا جن میں سے شامی کے جسم کا ایک ڈرا سا حصہ بھی نہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دودھ آگ میں آگ بن چکا تھا۔ پھر ناگ دیوتا کے کھلے ہوئے منہ سے لٹکی ہوئی زبان پر سے ہوتا ہوا ایک شعلہ اترتا اور اڑتا ہوا شامی کے گرد رقص کرتے ہوئے شعلوں پر آکر ا۔ ایک لمحے کے لئے شعلہ چمکتا نک بلند ہوتا اور پورے چوڑے پر پھیل گئے۔ پھر ایک دم سرد ہو گئے۔ شامو کی آنکھوں میں زندگی کی کرنیں لینے لگی۔ سردار نے سجدے سے سر اٹھایا۔ ان کے سامنے شامی کھڑی تھی۔ ایک عجیب روپ میں ---

اس کے جسم پر ناگ دیوتا کی کھال تھی۔ اس زردی مائل رنگ کی کھال پر جگہ جگہ ناگ دیوتا کی شبیہ کنڈلی مارے ہوئے موجود تھی۔ یہ کھال اس کے دائیں

ایک طرف بیٹھا تھا۔

وہ یہ سوچ سوچ کر دل کو جلا رہا تھا کہ شامی تو ناگن بن گئی۔ وہ اپنا انتقام بھی لے لے گی۔ پھر کیا ہو گا؟ پھر کیا ہو گا؟ شامی کے جسم میں ہر طرف زہری زہر ہے۔ اس کا اور شامی کا کبھی ملاپ نہیں ہو گا۔ کبھی ملاپ نہیں ہو گا۔۔۔ اور اس کی پلکیں نم ہو گئی۔

شامی نے اچانک اس کی طرف دیکھا اور اس نے شامو کے دل کی بات پڑھ لی۔ شرم سے وہ سرخ ہو گئی لیکن اس میں شامو کا کیا قصور تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اپنی محبت کو حاصل کرنا ہر ایک کے دل کی امنگ ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شامو کے پاس آگئی۔

”شامو۔“ اس نے آہستہ سے اسے پکارا اور شامو نے مچلا ہوٹ وائٹوں میں دہاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”میں جانتی ہوں شامو۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔“ وہ رخ سمیر کر کہتی ہو گئی۔ ”میں آج ہی ہلکا سے بات کروں گی۔ کوئی نہ کوئی رستہ تو ہو گا۔ مجھے یقین ہے ہم دونوں ضرور ملیں گے شامو۔“ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور شامو کے ممکن چہرے پر سرفی دوڑ گئی۔

☆○☆

”ہلکا۔ ایک بات پوچھوں؟“

”کیا بیٹی؟“

”ہلکا۔ کیا۔۔۔ کیا میرا بیاد شامو سے ہو سکتا ہے؟“ شامی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ ہو کیوں نہیں سکتا بیٹی!“ سردار کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”لیکن کیسے؟“ شامی تیزی سے بولی۔

”پہلے یہ بتاؤ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”ہلکا۔ وہ شامو نے کہا تھا کہ اب میرا بیاد اس سے ہرگز۔۔۔“

شامی نے کوڑھائی ہوئی پنڈلیوں تک چلی گئی تھی۔ اس کا ہلکا شانہ نکلا تھا۔ وایاں بازو بھی کھال میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک سنہری تاج تھا، بالکل ناگ دیوتا جیسا۔ وہ مکمل ناگن بن چکی تھی۔ مکمل ناگن۔۔۔

☆○☆

سردار آہستہ آہستہ اٹھا۔ اس نے ایک بار پھر ”شوگا“ کا نعرہ لگا کر اسے تعظیم دی اور اٹلے پاؤں چلتا ہوا شامی کے قریب آگیا۔ شامی کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ہر روشنی ماند تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس کی آنکھوں میں دیکنا محال تھا۔ ”شامی۔“ سردار خوشی سے کپکپاتے ہوئے لمبے لمبے میں بولا۔

”ہلکا۔“ وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔

شامو بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب آگیا۔ سردار نے اسے بھی اپنے دوسرے بازو میں لے کر سینے سے لگ لیا۔ شامو نے آہستہ سے شامی کے ہاتھ پر چمکی لی۔ شامی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ شامو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور چمک پڑا۔

اس نے ایک بار پھر غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے بدن میں سنہاٹ دوڑ گئی۔ شامی کی آنکھوں میں اسے ناگ دیوتا کی شبیہ نظر آئی تھی اور اس کے ماتھے پر بھی ناگ دیوتا کی شبیہ سنہرے رنگ میں چمک رہی تھی۔

”تو کیا؟“ اس نے سوچا۔

”ہاں شامو۔ میں ناگن بن چکی ہوں۔“ شامی نے اسے اپنی چمکدار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر اس کی بات کاٹ دی۔

شامو حیرت زدہ رہ گیا کہ شامی نے اس کے دل کی بات کیسے جان لی؟ سردار نے آہستہ سے ان کو الگ کر دیا۔ پھر وہ تینوں اٹلے پاؤں چوڑے کی میڑھیوں سے نیچے اتر آئے اور بے خوف و خطر ہنسنے لگے۔ وہ سناپوں پر قدم رکھتے ہوئے ہال سے باہر آ گئے۔

سردار کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور شامی۔۔۔ وہ تو ہر بات کو بھول کر اس دیرانے سے بہت دور شرمیں ہالو کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ایک شامو تھا جو افسردہ سا

سردار نے ایک ایک بات ذہن نشین کر لی اور لوٹ آیا۔ دپو تائے اسے شامی کے کسی معاملے میں بھی دخل دینے سے منع کر دیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شامی بے پناہ خطرات میں گمرے والی ہے لیکن دپو تائے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا۔ اس لئے وہ بے فکر ہو گیا تھا۔

شامو کے بارے میں بت سی باتیں معلوم کر کے شامی نے خوشی اور حیرانگی سے لے بلے جذبات سے پوچھا۔

”کیا یہ سچ ہے بابا؟“

”ہاں بیٹی۔“ سردار مسکرایا۔

”اوہ بابا۔“ وہ اس سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر بعد شامی نے اس سے اپنے متعلق پوچھا اور وہ اسے بتائے لگا۔

”جی شامو کے بارے میں تو میں تجھے بتا چکا ہوں۔ اب اپنے بارے میں سن لے۔“ اور شامی ہر تن گوش ہو گئی۔

”بیٹی۔ آج سے ٹھیک پانچ ماہ بعد تیرے ہاں ایک بچہ پیدا ہو گا۔ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔ یہ میں نہیں جانتا۔ اس بچے کی تمام خصوصیات سناؤں جیسی ہوں گی۔ لیکن چونکہ وہ ایک انسان کی نسل سے ہو گا اس لئے وہ تمام خصوصیات سناؤں جیسی رکھتے ہوئے بھی بعض باتوں میں انسانوں کی تقلید کرے گا اور بعض باتوں میں تجھ سے مختلف کیفیات کا حامل ہو گا۔ مثلاً وہ تیری طرح ہر وقت یعنی جس وقت چاہے ناگ یا ناگن کی شکل اختیار نہیں کر سکے گا۔ بلکہ ہر مہینے صرف آخری چار چاند راتوں میں خود بخود ذہن بدل کر ناگ یا ناگن کی شکل اختیار کرنے پر قادر ہو گا اور تو جس وقت چاہے ناگن کے روپ میں اور ناگن سے انسانی شکل میں آ سکے گی۔ پھر جب تو اپنا کام ختم کر لے گی۔ یہ میں نہیں جانتا کہ کیسے ختم کرے گی۔ کبھی سکے گی یا نہیں۔۔۔ تو تجھے ایک مجبور ہی آن پڑے گی بیٹی۔۔۔ اور اس مجبوری کے لئے تجھے ایک قربانی دینی پڑے گی۔ ایسی قربانی جس کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی۔“

”کیسی قربانی بابا؟“ وہ بے چینی سے بولی۔

”اچھا میں سمجھ گیا۔“ سردار نے شامی کی بات کاٹ دی۔ اس کے تجربہ کار ذہن نے اسے تمام معاملہ سمجھا دیا تھا۔

”میں آج ہی دپو تائے بات کروں گا بیٹی۔ پھر تجھے بتاؤں گا۔“

سردار کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جب وہ اٹھا تو ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ شامی اور شامو کے بیاد کا فیصلہ۔۔۔ لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے میں ابھی ایک مدت باقی تھی۔

وہ اپنے کمرے سے نکلا اور تھوڑی دیر بعد وہ شوگا دپو تائے کے چروں میں پڑا تھا۔ اس نے تین بار ”شوگا“ کا نعرہ بلند کیا جیسے کوئی بد روح جیج اٹھی ہو۔

”کیا بات ہے شانمان۔“ دپو تائی آواز مقرر تھرائی۔

”دپو تائے۔ تو سب کچھ جانتا ہے۔ تجھے سب معلوم ہے دپو تائے۔“ سردار سجدے سے سر اٹھا کر گونگڑایا۔

”ہمیں معلوم ہے شانمان۔ جا۔۔۔ تیری کسی خواہش میں رکاوٹ نہیں آئے گی۔“ دپو تائی زبان سے ایک پھنکار سنائی دی۔

”شامو کے بارے میں مجھے۔۔۔“

”ہر خواہش شانمان۔ تیری ہر خواہش بلا روک ٹوک پوری ہوتی چلی جائے گی۔ ہم تجھ سے بت خوش ہیں۔“ دپو تائے اس کی بات کاٹ دی۔

”دپو تائے۔“ سردار نے کہا۔

دپو تائی زبان سے ایک لہر نکلے۔ سفید رنگ کی تیز روشنی کی لہر اور شانمان کے سر پر آکر بجلی کی طرح کڑی۔ سردار شانمان کے ذہن میں مستقبل کی ایک ایک بات روشن ہو گئی۔ ایک ایک بات۔۔۔ شامو، شامی اور اس کے بچے کے متعلق ہر ایک بات۔

”دھیان رہے شانمان۔ تو شامی یا شامو کو مستقبل کی کوئی بات نہیں بتائے گا۔ یہ صرف تیرے لئے ہے۔ صرف تیرے لئے۔ وقت آنے پر شامو خود بخود ماماں چلا آئے گا۔ تو صرف شامی کو اس کے مستقبل کے بارے میں مناسب ہدایات دے سکتا ہے اور بس۔۔۔“

مکیا۔ سردار نے سجدے سے سر اٹھایا اور اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ وہ ہانگوں کی طرح پریشان، بال بکھرا، دیران آنکھوں سے دیوتا کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے آہستہ سے پاس پڑا ہوا اٹھایا اور اس کا منہ کھول دیا۔ تین بڑے بڑے نیلے تھیلے میں سے نکل کر بیٹھ گئے۔ سسے سسے۔ وہ اپنی تیز اور چمکدار آنکھوں کو اس طرح ادھر ادھر گھما رہے تھے جیسے کسی خطرے کی بوسوگھ رہے ہوں۔

سردار نے چونے سے چھری نکالی اور آہستہ سے رخ پھیر کر چہرہ نیولوں کی طرف کر لیا۔ باری باری تینوں نیولوں کو دیکھا۔ اس کی نظروں سے نظریں ملتے ہی نیلے ایک بار اچھلے اور بے دم ہو کر گر پڑے۔ ان میں زندگی کی لہر تپید ہو گئی۔ سردار نے آہستہ سے چھری والا ہاتھ اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے اس کی بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے خون کی دھار پھوٹ نکلی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور منہ کھولے پڑے نیولوں کے منہ میں خون کے کئی کئی قطرے ٹپک گئے۔ جو نبی اس نے ہاتھ ہٹایا، نیلے ترپ اٹھے۔ وہ اچھل اچھل کر گرنے لگے۔ گر کر کراچھلنے لگے۔ قلا پانیاں کھانے لگے جیسے ان کے جسم میں کوئی بدروح حلول کر گئی ہو۔ سردار کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر ایک بار زور سے اچھل کر وہ گر پڑے۔ حرکت سکون پانچی۔ سردار نے ان کو دموں سے پکڑ کر اٹھایا اور دو نیولوں کو ایک ایک ستون میں بجزکتے ہوئے شطوں کی نذر کر دیا۔ تیسرے کو زور سے چھت کی طرف اچھال دیا۔ ستونوں کی آگ پکایک اور زیادہ بھڑک اٹھی اور اس کا رنگ بدلنے لگا۔ آہستہ آہستہ آگ کا رنگ بالکل سرخ ہو گیا، جیسے اس میں خون مل گیا ہو۔

تیسرے نیلے کو چھت پر لٹکے ہوئے سانپوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نیلے کی بجائے راکھ کا چھوٹا سا ڈھیر ہال کے فرش پر گر پڑا۔ دوسری طرف ستونوں سے دو اور راکھ کے ڈھیر بلند ہوئے اور ہال میں جا کرے۔ شمالان نے راکھ شدہ نیولوں کی طرف دیکھا تو راکھ پھر نیولوں میں تبدیل ہو گئی۔ اب ہال کے سانپ اپنی لمبی لمبی سرخ زبانیں نکالے ان پر جھپٹ پڑے۔ ان گنت شیطانی بھڑکے اور چند لمحے بعد ایک بار پھر وہاں نیولوں کی بجائے راکھ کے ڈھیر پڑے تھے۔ سردار نے

”دیوتا کا حکم نہیں ہے بیٹی۔ اس نے تیری حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے۔ تو کسی بات کی فکر نہ کر۔“ سردار نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

”کچھ مت سوچ بیٹی۔ دیوتا ہر وقت تیرے ساتھ ہو گا۔ ہر مشکل میں تیرا وجود اس کے زیر سایہ رہے گا۔“ سردار نے اسے سمجھایا اور وہ باپ کے سینے سے لگ گئی۔

”کل ہمیں واپس جانا ہے بیٹی اور آج دیوتا کے آخری درشن کرنے ہیں۔ رات کو تیار رہنا۔“ سردار کہہ کر چلا گیا اور شاہی سوچ میں ڈوب گئی۔ آج انہیں یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔

”شاہی۔“ اس نے چونک کر دیکھا۔ شامو اس کے قریب کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر تمام سوچوں کے جال توڑ کر سکر اٹھ اس کے لیوں تک آ گئی۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کیا سوچ رہی تھیں؟“ وہ پیار سے اس کی زلفوں سے کھیلنے لگا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ اس کے سینے پر سر ٹکا کر بولی اور آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں خاموش ہو کر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سننے لگے۔ بہت دیر وہ اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ شامو نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور آہستہ آہستہ انہیں سسلانے لگا۔ شاہی ایک زراے سرور میں کھو گئی۔ پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

سردار اندر داخل ہوا۔

”آؤ بیٹی۔ آؤ شامو۔ چلیں۔“ اور وہ دیوتا کے درشن کرنے کے لئے چل پڑے۔



”شوگلا۔“

سردار کی آواز کی گونج سارے ہال میں سنائی دی۔ سب سجدے میں گر گئے اور ہال میں سانپوں کی پھنکاریں رک گئیں۔ ہر طرف ایک عجیب سا سکوت طاری ہو

آنکھوں کو حرکت دی اور وہ راکھ اکٹھی ہو کر ایک ڈھیلے کی شکل میں اڑتی ہوئی اس کے پاس آگری۔ سردار نے ایک تھیلی میں اس راکھ کو ڈالا اور تھیلی جیب میں ڈال لی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ناگ دیوتا کے قدموں میں جا کر۔

تھوڑی دیر بعد وہ زور زور سے کچھ پھرتے لگے۔ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ جوں جوں اس کی آواز بلند ہوتی گئی دیوتا کی زبان میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے چلے گئے۔ اس کی آنکھوں سے روشنی کی لہریں پھوٹنے لگیں۔ ہاتھ پر چمکتے من کی روشنی بڑھتی گئی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنی نے شامو اور شامی کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ شامو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ کو کوئی اور اٹھا رہا ہو۔ اس کا ہاتھ بلند ہوتے ہوئے ستون کے بڑھکتے شعلوں میں گھر گیا۔ پھر اس کا ہاتھ واپس اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے لیکن وہ کوشش کے باوجود نہ دیکھ سکا کہ اس کے ہاتھ میں کیا شے تھی؟

دوسری طرف شامی خود کو فضاؤں میں اڑاتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا ذہن خلاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ دل میں سرور و انبساط کی لہریں کڑھیں لے رہی تھیں اور آنکھیں ناگ دیوتا کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔

اچانک سردار نے "شوگاما" کا نعرہ بلند کیا۔ ساتھ ہی اس نے سر کو زمین پر پٹک دیا۔ نعرہ بلند ہوتے ہی شامی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر چوڑے کے بیچ میں لاکڑا لیا ہو۔ شامو بھی ایسی ہی حالت سے دوچار ہو کر اس کے قریب کھڑا تھا۔ غیر ارادی طور پر شامو کا ہاتھ بلند ہوا اور ہونٹوں تک آگیا۔ دوسرا ہاتھ بھی بڑھا اور اس نے بین کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ بین جسے اس نے شعلوں میں سے اٹھایا تھا۔ ایک شعلہ بین کی صورت میں اس کے ہونٹوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔

پھر دیوتا کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنی نے بھی سی حرکت کی اور شامو کی بین نے ایک غیر فانی دھن چمیز دی۔ شامی کے پاؤں نے غیر ارادی طور پر تھرنا شروع کر دیا۔ بین بھتی رہی۔ شامی رقص کرتی رہی۔ رقص جاری رہا۔ ایک شعر انجیز رقص۔ بین کی وجد آور آواز اور دنیا کا سب سے انوکھا رقص۔ بین سے

راگ پھونٹے رہے اور شامی کے پاؤں تھرتے رہے۔ شامی کا جسم پانی کی لہروں کی طرح حرکت میں تھا۔ وہ اس طرح رقص کر رہی تھی جیسے بین کی آواز سے مست ہوئی جا رہی ہو۔ شامو بھی بین بجاتا ہوا رقص کے انداز میں اپنے پاؤں کو حرکت دے رہا تھا۔ شامی کی نس نس میں بجلی بھری تھی۔ وہ برق کی طرح چمکتی ناگ دیوتا کے سامنے رقص کر رہی تھی۔ بین کی لے لہ بہ لہ تیز ہونے لگی اور شامی کا بدن بھی اور تیزی سے لرزے لگے۔ ناگ دیوتا کی آنکھوں کی روشنی ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ لہ بہ لہ روشنی، بین کی لے اور شامی کے رقص کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پھر بین کی آواز عروج پر پہنچ گئی۔ شامی کا رقص وقت کی رفتار کی طرح تیز ہوتا چلا گیا۔ تیز۔۔۔ اور تیز۔۔۔ اور تیز۔۔۔

یکدم شامو کی بین نے بھی لے کر دم توڑ دیا۔ شامی کے پاؤں ساکت ہو گئے اور وہ غیر ارادی طور پر ناگ دیوتا کے سامنے جھک گئی۔ ناگ دیوتا کی آنکھوں کی روشنی ایک جھماکے کے ساتھ ختم ہو گئی اور اس کے من سے نکلنے والی روشنی بھی بجلی پڑ گئی۔

سردار جو ابھی تک سجدے میں پڑا تھا اس نے سر اٹھایا اور دیوتا کے کھلے من سے ایک تھرقھرائی "نرائی" غیر انسانی آواز ابھری۔

"شامی۔ ہم۔۔۔ تیرے رقص سے خوش ہوئے۔ اور شامو۔۔۔ تجھ سے بھی۔" وہ دونوں کچھ اور جھک گئے۔

"شامو۔ جی۔ تجھے ایک مہربہ پھر یہاں آنا ہے۔ تجھے بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا ہے لیکن گھبرا نہیں۔ تجھ پر شامو پر شوگاما۔۔۔ شوگاما۔۔۔ کا سایہ ہے۔" آواز کی بازگشت بہت دیر تک ہال میں گونجتی رہی۔ پھر دیوتا کے کھلے من سے ایک شعلہ نکلا اور اس نے شامو اور شامی کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب شعلے کا وجود ختم ہوا تو وہاں شامی کے ساتھ ساتھ شامو کے سر پر بھی ایک سنہرا تاج جھک رہا تھا۔ سنہرا تاج۔۔۔ ناگ دیوتا جیسا۔

"شامو۔ مو۔" ناگ دیوتا کی پچکار پھر گونجی۔

شامو رکوع کی حالت میں جھک گیا۔ سردار بھی اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔ وہ

ذوب گئیں۔ سر پکرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بالکل صحیح حالت میں تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے مسکرا کر شادی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دی اور وہ تینوں دیو تائی کی طرف دیکھنے لگے۔

”شادی۔“

”دیو تات۔“ وہ جھک گئی۔

”تجھ پر ہمارے ازلی دشمن لنگشا کی طرف سے بہت سی مشکلیں آئیں گی۔ وہ تم سب پر وار کرے گا لیکن گھبرا نہیں۔“

”دیو تات! سارے ہم پر رہے۔ ہمیں کوئی غم نہیں۔ ہم کسی مشکل سے نہیں ڈرتے۔“ شادی کی آواز ابھری۔

دیو تاجک دیر خاموش رہا۔ پھر اس کی سمجھ اور سارے ہال میں قہر قہرائی آواز گونجی۔ ”جاؤ میرے بچو۔ میرے بچاویو۔ شوگا تمہاری حفاظت کرے گا۔“

دیو تاجک منہ سے ایک شعلہ نکلا جس نے ان تینوں کو اپنی لپٹ میں لے لیا۔ چند لمحوں بعد جب شعلے کا وجود ختم ہوا تو وہ اپنے جسم میں نئی طاقت، نئی انگلیں، نئی ہمت، نیا جوش محسوس کر رہے تھے۔ وہ اٹھ کر اگلے پاؤں چبوترے کی بیڑیاں اتر آئے۔ سارے ہال میں ’فرش پر‘، دیواروں پر، پھت پر پھیلے ہوئے سانپوں کی پینکھاریں یکدم تیز ہو گئیں۔ شعلے زیادہ تیزی سے ابھرنے لگے، جیسے وہ ان کو الوداع کہہ رہے ہوں۔ وہ تینوں سانپوں پر چلنے اور ان کی پینکھاریں نئے، شعلے دیکھتے ہوئے باہر آگئے۔

بوڑھے پجاری نے شادی کو جھک کر تعظیم دی اور ان کو دروازے تک چھوڑے آیا۔ اب ان کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ بالکل خالی ہاتھ وہ دروازے سے باہر نکلے۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ دروازے کے باہر اکی سوا بیہ گھاس لہرائے گئی۔ سرسرا نے گلی جیسے وہ ان سے کچھ کہہ رہی ہو۔ جیسے سانپ پینکھا رہے ہوں۔

سردار نے چوٹے میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے ہاتھ میں نیولوں کی راکھ والی قہیلی آ گئی۔ اس نے قہیلی کا منہ کھولا اور چٹکی بھر کر راکھ گھاس کی طرف اڑا دی۔ جہاں

اور شادی بھی جھک گئے۔

”شامو۔ اس تاج کو سر سے اتار لے۔“ اور شامو نے سر سے تاج کو اتار لیا۔

ناگ دیو تاجک منہ سے پھر ایک شعلہ نکلا جس نے تاج کو اپنے حصار میں لیا۔ توڑی دیر بعد وہاں تاج کی جگہ ایک انگوٹھی بنگا رہی تھی۔ سنہری انگوٹھی، جس میں جھینگہ کی جگہ ناگ دیو تاجک منہ بنگا رہا تھا۔ اس سے دودھیا روشنی خارج ہو رہی تھی۔ دیو تاجک کھم پر شامو نے انگوٹھی پائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پسلی۔

”شامو۔ دیکھنے میں یہ انگوٹھی ہے لیکن حقیقت میں یہ ہمارا بیٹھا ہوا تاج ہے۔ یہ ہر جگہ تیرے کام آئے گا۔ صرف ”شوگا“ کتنے کی دیر ہے۔“ شامو نے ممنونیت سے دیو تاجک کو شکریہ ادا کیا۔

”شامان۔“ دیو تاجک آواز آئی۔

”دیو تات۔“ سردار جھکے جھکے بولا۔

”شامو کو ہماری بخشی ہوئی طاقت سے دوسری دنیا سے روشناس کرا دے تاکہ شادی کو کوئی وقت نہ ہو۔“

”دیو تات۔“ سردار کہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سردار نے شامو کی طرف دیکھا اور شامو کو اس کی نظریں اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن اس نے اس کی نظروں سے اپنی نظروں کا تسلسل توڑنے کی کوشش نہ کی۔ ان کی نظریں ایک دوسرے کی نظروں میں مگر کر رہ گئیں۔

”شامو۔“ سردار کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

”سردار۔“ شامو کھوکھی آواز میں بولا۔

”تو شادی کے ساتھ شرب جائے گا۔“

”ہاں سردار۔“ شامو کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے آئی۔ اور شامو کے ذہن میں جیسے شہر کا نقشہ کھینچ گیا۔

سردار نے اس کی نظروں سے کچھ دیر بعد اپنی نظروں کا تسلسل توڑ دیا۔ شامو کے ذہن میں ہلکا سا دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے اندھیرے میں





گنگشا بھی ایک ناگ دیوتا تھا۔ اس کی شوگام سے صدیوں پرانی دشمنی تھی۔ کیونکہ شوگام نے اس کی سنگیتر گانیشا کو اپنی محبت میں گرفتار کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ شوگام نے گانیشا کو کہاں رکھا تھا یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ گانیشا، شوگام اور گنگشا کے خاندانوں میں سب سے خوبصورت ناگین دیوی تھی۔ شوگام دیوتا بھی کچھ کم نہ تھا۔ شوگام اور گنگشا ایک رات جنگل میں آنے سامنے ہوئے اور وہیں سے ان کی محبت کا آغاز ہوا۔ پھر گنگشا کی سنگیتر گانیشا نے تمام خاندان کی مخالفت کے باوجود شوگام سے شادی کر لی۔ وہ دونوں ہمیشہ کے لئے اپنی دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ گنگشا انتقام کی آگ میں سگتا رہا۔ وہ شوگام سے انتقام لینا چاہتا تھا اور آخر کار اسے ایک دن شوگام کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا لیکن وہ اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ گانیشا کہاں ہے؟

تب گنگشا نے شوگام کے بچاریوں کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ کئی بچاریوں کے خاتمے کے بعد شوگام کا بیاناہمبر لہرز ہو گیا۔ اس نے جو اپنی حملہ کر کے گنگشا کے آگے سے زیادہ بچاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے بچاریوں کی خود حفاظت شروع کر دی۔ وہ صدیوں سے اسی طرح لڑتے آ رہے تھے۔ شوگام ہر چیز میں گنگشا سے بڑھ کر تھا۔ حسن، طاقت، انصاف، رحمتی، ان سب میں وہ گنگشا سے برتر تھا۔ گنگشا بھی خوبصورت تھا لیکن شوگام کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ کبھی وہ بھی انہی خوبیوں کا مالک تھا لیکن جب انتقام کے شعلے بجڑنے کو اس کی تمام خوبیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ اب وہ صرف شوگام کے خون کا پیاسا تھا اور بس۔۔۔ اس انتقامی جذبے نے اس کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دیا تھا۔ ان کی دشمنی نچالے کتنی صدیوں سے چلی آ رہی تھی مگر ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے دار کو جلد یا بدیر ناکام بنا دیتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی شکست ماننے کو تیار نہ تھا۔



رات آدمی سے کچھ زیادہ جا چکی تھی۔ وہ جنگل کے تاریک حصے میں داخل ہو چکے تھے، جہاں دن کے وقت بھی سورج کی روشنی کی کرن تک نہیں پہنچتی تھی اور

یہ تو رات تھی۔ ہر طرف گھٹا ٹپا اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ ہر طرف لاکھوں حشرات الارض رینگتے پھر رہے تھے۔ ان میں زہریلے بچھو بھی تھے اور سانپ بھی۔ ان کی پٹکاروں سے فضا میں عجیب سی گونج پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ان کے قریب آتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی اوپر اور بھاگنے لگتے۔ سردار سب سے آگے چل رہا تھا۔ انہیں راستے پر گرنے میں کوئی وقت نہ ہو رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں پریشیدہ طاقت سے انہیں ہر چیز صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چلتے رہے۔ چلتے رہے۔ شامو اور شاہی حسب معمول سب سے پیچھے چل رہے تھے۔ شامو نے شاہی کی کر کے گرد اپنا بازو حائل کر رکھا تھا اور وہ اس کا سہارا لے کر اس کے چوڑے چنگے سینے سے گئی چل رہی تھی۔ شاہی کا بایاں بازو شامو کی کر میں حائل تھا۔ شامو کبھی کبھی شرارت سے اسے اپنے ساتھ دپالیتا تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتی اور شامو ہولے سے مسکراتا۔

اچانک سردار نے ہاتھ اٹھا کر انہیں رک جانے کا اشارہ کیا۔ ان کی آنکھیں سامنے جی ہوئی تھیں جہاں ایک بہت بڑا اڈوہا موجود تھا۔ وہ اپنا غار نمائندہ کھولے ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے اور جب وہ منہ کھولا تو اس کی دھنٹ لمبی زبان باہر نکل آتی۔ اس کے منہ سے نکلنے والے آگ کے شعلے ہر وہ چیز جو ان کے سامنے آ رہی تھی، خس و خاشاک کرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے آگ ہی آگ پھیلی ہوئی تھی اور ان کو مت بچھو اور سانپ اس آگ میں جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ جو جگہ گئے تھے وہ گھبرا کر ان کی طرف ریلے کی صورت میں بڑے چلے آ رہے تھے۔

سردار نے اس نازک صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اچانک وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے سروں میں دھماکے ہوئے لگے۔ سردار کے ساتھ آئے ہوئے دو خادموں میں سے ایک اڑتا ہوا اڈوہے کے منہ میں جا رہا تھا۔ اس کی چھین بڑی کینٹاک تھیں۔

سردار کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے جڑے بھیج لئے۔ اس نے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے کر لیا اور خود ان کے آگے چٹان کی مانند جم کر کھڑا ہو گیا۔

جس راستے سے وہ مندر کی طرف آئے تھے، سردار نے راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔

کافی دور آ جانے کے بعد وہ ایک کھلے میدان میں ٹکے جو گئے درختوں اور جمائوؤں سے بھرپور تھا۔ لیکن میدان اس لئے تھا کہ اس کے چاروں طرف چٹانیں حصار کئے ہوئے تھیں۔ وہ میدان پار کرنے لگے لیکن ابھی وہ میدان کے درمیان میں پہنچے ہی تھے کہ ان کو رک جانا پڑا۔

ایک بہت بڑا نیولا ان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ ایک بڑا چمڑکا تھا لیکن اس کے قریب آتے ہی اس میں حرکت آگئی۔ وہ اپنا سرخ منہ اٹھائے انہیں اپنی بڑی بڑی چکدار آنکھوں سے گھورتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

سردار نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا اور چند لمحوں بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس نے نظریں سمجھا کر شامو کے ساتھ گلی کھڑی شامی کو دیکھا۔ شامی اور سردار کی نظریں ایک لمحے کو ملیں اور سردار نے آنکھیں پٹالیں۔ شامی نے شامو کی طرف دیکھا اور آہستہ سے اس سے الگ ہو گئی۔

دوبو قامت نیولا ان سے تقریباً "دس فٹ دور رہ گیا تھا۔ اب اس کی رفتار کچھ اور کم ہو گئی تھی۔ یوں لگتا جیسے وہ ایک دم حملہ کر دے گا۔ شامی شامو سے الگ ہو کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی نیولے کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔ نیولا ٹھک کر رک گیا۔ سردار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھا اور بھوک مار کر وہیں اپنی جگہ پر آ گیا۔ پھر شامی کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ سکوت میں ڈوبی ہوئی فضا دردم برہم ہو گئی۔ وہ شیشا نہ توڑا۔ تین دھنک فضا کا سکوت ٹوٹا۔

"شوگما"

اور --- شامی نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ نیولا اسے اپنی بڑی بڑی چکدار آنکھوں سے گھورتے جا رہا تھا۔ شامی نے ایک بھری لی لی اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے ہاتھ اور شامو کو ایک عجیب محسوس دیکھنا پڑا جو صرف ایک لمحے کے لئے ہی ان کو حیرت زدہ کر سکا کیونکہ وہ سب کچھ جانتے تھے۔

شامی شامو کے سینے سے لپٹی کھڑی تھی اور شامو اپنے ایک ساتھی کی اس دردناک موت پر جیسے سلگ اٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں غیب و غشب سے چمک رہی تھیں۔ سردار نے آہستہ سے چہرے میں ہاتھ ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں چمکی دہی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ کھولا اور چمکی بھر کر راکھ نکال کر چمکی بھر جیب میں رکھ لی۔ اڈوہا ان کے بالکل سامنے آ چکا تھا۔ ان سے تقریباً چھ فٹ دور وہ آگ پھیل رہا تھا۔

سردار نے "شوگما" کا لفظ سرسراہٹ کے انداز میں ادا کیا اور راکھ اڈوہے کی طرف اڑا دی۔ راکھ اس پر موت بن کر جھٹ پڑی۔ اڈوہے تک پہنچے پہنچے راکھ ایک بہت بڑے شعلے میں تبدیل ہوئی۔ پھر اس شعلے نے اڈوہے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اڈوہے کے منہ سے ٹپٹیک ایک زبردست کراہ نکلی اور وہ زمین پر لوٹ پٹ ہوئے لگا۔ سردار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اڈوہے کی کراہیں مستقل صورت اختیار کر گئی۔ اس کی ٹھک شگاف جچ فاکراہیں دل دلا رہی تھیں اور ہر کراہ سن کر یوں لگتا تھا جیسے "گن۔ گن۔ گن۔" کا لفظ ابھرا ہو۔

چند لمحوں بعد وہاں اڈوہے کی بجائے راکھ کا ڈھیر پڑا تھا اور ان کو ٹپٹیک بھر بھری آگئی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھوٹا ان کے قریب سے گزر گیا۔ انہوں نے اطمینان بھری سانس لی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بھر پل پڑے۔ ان کی آنکھیں اپنے ایک ساتھی کی موت پر غم تھیں۔

وہ چلتے رہے۔ چلتے رہے اور آخر تاریک جھے سے نکل آئے۔ وہ جنگل کے ایک دوسرے کٹے لیکن چاند کی روشنی سے منور جھے میں کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس جھے کے درمیان سے گزرنے والی پلٹ بڑی سے گزر رہے تھے۔ شامی اب بھی شامو کے ساتھ گلی چل رہی تھی۔ سردار نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی تھی اور اس کا ساتھ دیتے ہوئے وہ بھی تیز تیز چلنے لگے تھے۔ پھر سردار رک گیا۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا۔ اس کے پاس ادھر ادھر چند کالی جتی بڑیاں آوارگی کر رہی تھیں۔ سردار نے چاند کے پاس چمکتے ہوئے ستاروں سے کچھ حساب لگایا پھر اس نے ایک دوسرے راستے پر قدم بڑھا دیے۔

آنکھیں تو پہلے ہی دار میں ضائع ہو چکی تھیں اور باقی جسم تقریباً "جل چکا تھا۔ اس نے ایک زوردار چیخ ماری جیسے کوئی زخمی ہاتھی چٹکھا ہو، پھر اس کا وجود ساکت ہو گیا۔ اس کی چیخ صاف طور پر "گن۔ گا۔ شا۔" کی پکار سانی دی تھی۔

ناگن اپنا چمن اٹھائے بڑے غور سے نیولے کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کا وجود بالکل ختم ہو گیا۔ اب وہاں راکھ کا ڈھیر تھا۔

سردار نے ناگن۔ "شانی" کی طرف دیکھا۔ اس نے زمین پر ایک پتھار ماری۔ زمین پر آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ناگن نے جلدی سے ان بھڑکتے شعلوں میں اپنی دم رکھ دی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی دم پر آگ پھیل گئی۔ صرف اس لمحے پر جہاں زخم لگا تھا۔ وہ بڑے سکون سے شعلوں میں دم دینے لگی رہی۔ پھر یکدم شعلے بجھ گئے۔ اس نے ایک بار آسمان کی طرف منہ کر کے چمن لہراتے ہوئے پتھار خارج کی اور ایک شعلہ آسمان کی طرف کھلی فضا میں گم ہو گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد اپنی دم کو زمین پر ٹکائے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ناگن کی بجائے شانی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور سردار نے اسے سینے سے لگا لیا۔ سردار نے اس کے پیروں کو دیکھا۔ وہاں کوئی نشان نہ تھا۔ شانی نے مسکراتے ہوئے شامو کی طرف دیکھا اور جواب میں وہ بھی مسکرا پڑا۔

وہ بھر چل پڑے۔ اپنے راستے پر۔ آنے والے ہر خطرے سے بے نیاز۔ گزرے ہوئے خوفناک واقعات کو دل میں جگہ دینے بغیر، بے خوف و خطر وہ آگے بڑھنے لگے۔ دو جگہ فتح حاصل کر کے ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔

☆☆☆

رات اپنے آخری پیر میں داخل ہو چکی تھی۔ اب وہ جنگل کا سرسبز و شاداب حصہ طے کر رہے تھے۔ اس کے بعد انہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ وہ بغیر کسی خطرے سے دو چار ہوئے جنگل پار کر آئے۔

اب وہ جنگل سے باہر کھڑے تھے۔ اس خوفناک جنگل سے باہر جہاں انہوں نے

شانی کی جگہ ایک ناگن کھڑی مارے بیٹھی اپنا چمن لہرا رہی تھی۔ اس کی بے چمن زبان بار بار اندر باہر آ جا رہی تھی اور پتھاروں سے شعلے نکل رہے تھے جو اوڑھ نیولے کی طرف جا رہے تھے۔ نیولا ایک لمحے کے لئے ٹھٹھا۔ پھر اس نے حملہ کرنے کے انداز میں اپنے جسم کو سکڑ لیا۔ اس کا ہیٹ زمین پر لگ گیا۔ اس کی آنکھیں ایک بار وحشیانہ انداز میں پھلکیں۔ منہ سے ایک غراہٹ سی خارج ہوئی۔ اس نے جست لگائی اور ناگن پر آ رہا۔

ناگن نے اپنے چمن کو حرکت دی۔ اس کا چمن تو نیولے کی دوسری جانب لپک گیا لیکن دم اس کے منہ میں آگئی۔ ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ ناگن کا چمن نیولے کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے دب گیا تھا اور وہ لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس کی دم زخمی ہو گئی تھی۔ وہ اپنا چمن چھڑانے کے لئے پوری طاقت صرف کر رہی تھی لیکن نیولے کے بے پناہ وزنی جسم کے نیچے اس کا چمن دب کر رہ گیا تھا۔ نیولے کے بڑے سے منہ میں اس کی دم دبی ہوئی تھی۔ پھر اس میں سے خون کے قطرے چپٹے لگے۔ خون کا پٹینا تھا کہ جیسے ناگن کے جسم میں برقی رد و دوڑ لگی۔ اس نے ایک زور وار پٹا پٹا کھایا اور نیولا دوسری طرف الٹ گیا لیکن ساتھ ہی ناگن بھی الٹ پلٹ ہو گئی۔ کیونکہ نیولے نے اس کی دم نہیں چھوڑی تھی۔ تاہم اس کا چمن آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے ایک زور وار پتھار ماری اور زمین پر آگ لگ گئی۔ گھاس نے آگ پکڑی۔ نیولے نے اپنے نوکدار ناخن ناگن کے جسم پر گاڑنا چاہے لیکن اب وہ مزید زخم لگوانے کو تیار نہ تھی۔ اس نے منہ نیولے کی طرف موڑا اور زور سے پتھار ماری۔ آگ کا ایک بڑا شعلہ نیولے کی آنکھوں پر گرا اور اس نے زور سے چٹکھا کر، کراہتے ہوئے اس کی دم چھوڑ دی۔

ناگن آزاد ہو گئی۔ پھر اس کی پتھاریں مسلسل گونجنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد نیولے کے سارے جسم پر آگ لگ چکی تھی۔ وہ جل رہا تھا۔ اس کے جلنے کی سزا دہل گئی۔ ناگن آخری بار اس کی طرف منہ کر کے پتھار ماری اور پرے رینگ گئی۔ نیولے کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ ترپ رہا تھا۔ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

گیا تھا۔ ان کی شہزادی واپس آگئی تھی۔ ان کی بستی کا سب سے کڑیل، طاقتور اور بہادر نوجوان شامو لوٹ آیا تھا۔۔۔ وہ کامیاب لوٹے تھے۔

سردار نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور نغماتیں بکدہم غمراؤ پیدا ہو گیا جیسے کسی نے ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لی ہوں۔

”میرے بچو، کیسے ہو؟“ سردار کی آواز میں ہلکی سی چکپاٹ تھی۔

”سردار کا سایہ ہم پر سلامت رہے۔“ جہوم میں سے کئی آوازیں ابھریں اور وہ سب دوبارہ غمراہ لگنے لگے۔ سردار نے انہیں خاموش ہونے کا کوئی اشارہ نہ کیا۔

تخت لایا گیا۔ گھانٹا پھونک ڈال کر ہانسون کی مدد سے بنایا گیا تخت۔ اس پر سردار کو بٹھایا گیا۔ شاہی اور شامو بھی الگ الگ تخت پر بیٹھے۔ پھر جہوم نے ان کے تخت اپنے کندھوں پر اٹھائے۔ لوگ ان پر پھول برسا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ گارہے تھے۔ ہر طرح سے اپنی دلی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ شامو عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ اسی طرح ان کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے وہ بستی کی طرف چل پڑے۔ بیٹے گائے، اچھلتے کودتے۔ شاہی اور شامو ایک دوسرے کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ سردار ہاتھ اٹھا کر جہوم کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ جہوم میں شامل لڑکیاں شامو کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سینک رہی تھیں۔ ان کے دل میں شامو کے لئے محبت کا سمندر غامضیں مار رہا تھا۔ بستی کی ہر جوان لڑکی کی تمنائیں تھیں کہ وہ شامو کی دلہن بنے لیکن شامو تو ازل سے کسی اور کا تھا۔ اپنی شاہی کا تھا۔ اسی طرح ہنگاموں میں گھرے ہوئے وہ بستی میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

وقت باد نسیم کے جھونکے کی طرح لہراتا ہوا مگر گریا اور شاہی کے ماں پننے کا وقت آن پہنچا۔

اس کے آگے آگ کا الازدہک رہا تھا۔ ایک بہت بڑے پتھر کے پالے میں آگ کے شعلے جھڑک رہے تھے۔ وہ دو زانو بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دائیں اور بائیں ایک طشت میں کوئی سنوف رکھا ہوا تھا۔ سردار دتھے دتھے سے

موت سے جنگ لڑی تھی۔ جس کے پار سے انہوں نے زندگی کی عجیب و غریب حقیقتیں حاصل کی تھیں۔

یہاں سے ان کی بستی بہت قریب تھی۔ انہوں نے اپنے جسم میں طاقت کی نئی لہرس دوڑتی ہوئی محسوس کیں۔

اپنے وطن، اپنی بستی، اپنے گھر جلد از جلد پہنچنے کی خواہش ان کے دل میں خوشی بن کر دوڑ گئی۔ وہ تیز تیز چلنے لگے۔ پھر سردار نے ان کو رکنے کا اشارہ کر دیا۔

وہ ایک بلند جگہ پر کھڑے تھے اور بستی کا ہر حصہ ان کے سامنے تھا۔ ان کی اپنی بستی۔۔۔ ان کا اپنا گھر۔

”ہاں۔“ سردار نے خادم کو بھی آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اس کے قریب آ گئے۔

”جاؤ۔ بستی میں میرے بچوں کو میری آمد کی اطلاع کرو۔“ سردار نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ دونوں سر جھکا کر اسے تعظیم دے کر پیچھے اترنے لگے۔

سردار شاہی اور شامو کو لے کر ایک کھنے درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر گزر گئی۔ سردار بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا اور شاہی اور شامو ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پیار بھری باتیں کرتے رہے، خاموش زبان میں۔

اور تب۔۔۔

”سردار زندہ باد۔“

”شہزادی زندہ باد۔“

”شامو زندہ باد۔“

کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ سردار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ چیل گئی جیسے وہ سب اس کی حقیقی اولاد ہوں۔

اس کا اپنا خون ہوں۔

ہائیں کی سرکردگی میں عورتوں، بوڑھوں، بچوں، جوانوں اور کنواریوں کا ایک بڑا جہوم ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کسی کو اپنا ہوش نہ تھا۔ ان کا سردار واپس آ

لے صاف طور پر میں شوگاما کو کنڈلی مارے بیٹھا دیکھا۔ اس کا بچن اور اوسر لہرا رہا تھا۔

”شاما۔۔۔۔۔ن۔۔۔۔۔“ دیوتا کی پھنکار سنائی دی۔

”دیوتا۔۔۔۔۔سردار نے سر جھکا دیا۔

”وقت آگیا ہے شاما۔۔۔۔۔“ دیوتا کا بچن زور سے لہرایا اور ایک خوفناک پھنکار سنائی دی۔ سردار کا جسم بالکل ساکت تھا۔

”شاما۔۔۔۔۔ن۔۔۔۔۔“ صبح تیرے پاس ایک بوڑھی عورت آئے گی جو ”جیسینا“ ہماری ایک پجاری ناگن ہے۔ وہ دایا کا کام سرانجام دے گی۔۔۔۔۔ دیوتا تمہوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

”بچے کے جنم کے بعد چوتھے دن۔۔۔۔۔“ دیوتا پھر پھنکارا۔ ”وہ عورت غائب ہو جائے گی لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ بچے کو بھونپڑے سے باہر نہیں جانا چاہیے اور نہ کوئی پانچواں شخص بچے کو دیکھنے پائے۔ دایا، شامو، شاجی اور تیرے سوا کوئی بچے کو نہ دیکھے۔ یاد رہے۔“

دیوتا رک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر پھنکارنے لگا۔

”اسے شاجی کا دودھ“ جو زہر ہے، صرف ایک دھن پلانا اور اس کے بعد اسے خالص دودھ پلانا چاہیے۔۔۔۔۔“ دیوتا ہدایات دیتا رہا۔ ”جب اس کی عمر ایک برس کی ہو جائے گی تو ہم پھر آئیں گے۔ اس وقت اصل میں اس کی عمر اٹھارہ برس ہو گی۔ کیونکہ شاجی جن مرحلوں سے گزری ہے ان کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے بچے کی عمر بڑھ جائے اور چونکہ وہ بھی اب وہ ناگن ہے اس لئے اس کے ہونے والے بچے کا واسطہ براہِ راست ہم سے ہے۔ اسے ناگن ہم لے جایا ہے اور ہم ہی اس کے بچے کو بھی اس کی منزل پر پہنچنے تک اپنے زیرِ سایہ رکھیں گے۔“

”دیوتا۔۔۔۔۔سردار نے ایک ایک بات ذہن نشین کر لی۔

”اچھا شاما۔۔۔۔۔ن۔۔۔۔۔ ہم جا رہے ہیں۔ شوگاما تم سب پر اپنا سایہ رکھے گا۔“

ایک زور دار پھنکار گونجی اور مدیم یکدم سفید ہو گیا۔ اس کی نیلاہٹ فتم ہو

ہاتھ بڑھاتا اور تمہوڑا سامنوف شعلوں کی نذر کر دیتا۔ تب آگ میں یکدم تیزی آ جاتی۔ اس کے شعلے بہت بلند ہو جاتے اور اپنی سرخ سرخ زبان نکال کر سردار کی طرف لپکتے۔ سردار آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتا جاتا اور ہاتھ اپنا کام کئے جا رہے تھے۔ اسے تین راتیں ہو گئی تھیں۔ لیکن ابھی تک دیوتا کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ وہ مسلسل اپنا عمل کئے جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عین وقت پر دیوتا اسے جواب ضرور دے گا۔ ابھی وقت نہیں تھا اسی لئے دیوتا خاموش تھا۔

پھر چوتھی رات دیوتا نے اسے درشن کرا دیئے۔ اس نے جب ایک بار سنوف آگ کے دھکنے الاؤں میں ڈالا تو شعلے بہت بلند ہو گئے۔ ان کی سرخ زبانیں سردار کی طرف لپکنے کی بجائے سفید پتھر کی طرف لپکیں اور فضا میں ایک پھنکار کی آواز گونج اٹھی۔ سردار چونک پڑا۔ اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ سفید من ہلکا ہلکا ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں من پر جمادیں اور مٹھی بھر کر سنوف آگ میں ڈال دیا۔ شعلے بھڑکے اور پھر وہ سفید من پر لپک پڑے۔ انہوں نے من کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ان کی سرخ زبانوں نے من کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ سردار نے زور زور سے کچھ پڑھتے ہوئے مٹھی بھر سنوف پھر شعلوں کی نذر کر دیا۔ شعلے کچھ اور بلند ہو کر سفید من کے رنگ کو اور کھرا کر گئے۔ اب اس کا رنگ کھرا ہلکا ہو چکا تھا۔ جیسے نیلا آکاش۔ سردار پھنکاروں کی آوازیں صاف طور پر سن رہا تھا۔ اس نے تیسری بار مٹھی بھر کر سنوف آگ میں ڈالا اور ”ش۔۔۔۔۔گا۔۔۔۔۔“ کا نعرہ اس کی زبان سے آزاد ہو گیا۔ اس نے آنکھیں من پر گاڑ دیں۔ شعلے سانپوں کی طرح پھنکارتے ہوئے من کی طرف بڑھے اور کتنی ہی دیر کے لئے من سرخ شعلوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ پھر شعلے آہستہ آہستہ اپنا جہم کھٹانے لگے جیسے کوئی ان کو پیچھے سے کھینچ رہا ہو۔ آخر وہ اس طرح پتھر کے پالے میں گم ہو گئے جیسے سانپ اپنے نوکرے میں چلے گئے ہوں۔ جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ ان کے غائب ہوتے ہی فضا ایک زبردست پھنکار سے دہم برہم ہو گئی۔

سردار اپنی جگہ سے اٹھ کر من کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی من پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک فضا میں پھنکاریں گونجتی رہیں۔ پھر سردار

گئی۔ ایک دم پتھر کے پالے میں شعلے بھڑک اٹھے۔ دیوتا جا چکا تھا۔ من بالکل اصلی حالت میں آچکا تھا۔ اس میں سے دیوتا کی زندہ شبیہ غائب ہو چکی تھی۔

”شوگنا۔“ سردار آہستہ سے سرسرایا اور اس نے سر اٹھایا۔ اسی وقت باہر مرغ نے صبح ہونے کی نوید دی۔

سردار نے کچھ پڑھ کر من پر پھونک ماری اور من کو اٹھا کر آہستہ سے شعلوں کی نذر کر دیا۔ شعلے ایک لمحے کے لئے تیز ہوئے پھر آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے جیسے وہ من کے اندر سارے ہوں۔ چند لمحوں بعد وہاں شعلوں کا نام و نشان نہ تھا۔ سردار نے پیالے سمیت من کو اٹھایا اور اسے لے جا کر ایک بڑے سے صندوق میں رکھ دیا۔ صندوق والا شٹ اٹھایا اور اسے بھی صندوق میں رکھ دیا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر وہ چوڑے پر لپٹ گیا۔ کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا اور اب اسے آرام کی ضرورت تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

☆○☆

شامو اور سردار بے چینی سے جمبو پڑے میں ٹپل رہے تھے۔ صبح سردار کو شامو نے آکر بگایا کہ ایک بوڑھی عورت اسے ملنا چاہتی ہے۔ سردار تیزی سے باہر نکل آیا۔ ایک خفیہ کمر بڑھانے بجک کر اسے تعظیم دی۔ اس کی طوطے جیسی ناگ ادھر پر ہونٹ کو چھو رہی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ ہنک تھی۔ سر کے بال بالکل سفید تھے اور جسم نہایت لاغر۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ سردار نے اسے اس کی خواہش کے مطابق فوراً ہی شامی کے جمبو پڑے میں پہنچا دیا۔ شامی اپنے بستر پر پڑی بے چینی سے کہو نہیں بدل رہی تھی۔ پھر وہ دونوں بڑھیا کا اشارہ پا کر باہر نکل آئے اور اپنے جمبو پڑے میں آکر بے چینی سے نیچے کا انتظار کرنے لگے۔

کافی دیر گزر گئی۔ پھر بڑھیا نے جمبو پڑے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”سردار۔۔۔ لڑکی۔“

”اوہ۔“ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ بڑھیا نے بھی ان کے پیچھے ہی قدم بڑھا دیئے۔ وہ جمبو پڑے میں داخل ہوئے۔ شامی گردن تک ایک

سفید چادر میں لپی ہوئی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے غلوٹی ہونٹوں پر ایک لالہوتی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پهلو میں ریشم کی کمال میں لپٹا ہوا ایک بچہ تھا۔ سردار جلدی سے آگے بڑھ کر اس پر بجک گیا۔ وہ اس کی نواہی تھی۔ اس کی شامی کی بیٹی۔ سردار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور خوشی کے مارے اس کی آنکھیں بھرا لیں۔ اس نے بجک کر اس کی پیشانی چوم لی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”شامو، دیکھو میری بچی کتنی خوبصورت ہے۔“ اس کی پلکوں پر چمکتے ہوئے ستارے لرزے ہوئے نیچے آ رہے۔

شامو آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے بجک کر بڑے غور سے شامی کی بیٹی کو دیکھا۔ پھول جیسا نرم و نازک جسم۔ سرخ و سفید رنگ۔ اس نے بجک کر لرزے ہوئے ہونٹ اس کی پیشانی پر اور پھر دونوں گالوں پر رکھ دیئے۔ جانے کیوں وہ بہت غمزہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ایک نظر سوئی ہوئی شامی کو دیکھا اور اٹھ کر پرے ہو گیا۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ اس کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ شامی کی بیٹی۔۔۔ جس کا باپ ایک شہری بابو تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ سردار پھر آگے بڑھا اور بجک کر غور سے اپنی نواہی کو دیکھنے لگا۔

”سردار۔ اب انہیں تنہا چھوڑ دیجئے۔“ بوڑھی کی کھرکھرائی آواز سن کر سردار ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے پیار بھری نظر شامی اور اپنی نواہی پر ڈالی اور پلٹ پڑا لیکن شامو غائب تھا۔

”یہ شامو کہاں گیا؟“ وہ بڑبڑایا اور جمبو پڑے سے باہر نکل گیا۔

اور شامو۔۔۔ وہ اپنے جمبو پڑے میں بستر پر اونٹھا پڑا تھا۔ بال پریشان، چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں سے تھوہل کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے چہرے کو بھگو رہی تھیں۔

اس خوشی کے موقع پر یہ آنسو!

یہ وہی جانتا تھا کہ شامی کے ساتھ جب بابو کا بیاہ ہوا تھا تو اسے اسی طرح کی حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا اور آج اس کے دل کا ہر زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔ ان



سردار جلدی سے جموئیزے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھوں پر ریشم کی کھال میں لپیٹی ہوئی شاکی تھی۔ وہ چھ سال کی معلوم ہوتی تھی حالانکہ اس کی ظاہری عمر صرف ایک سال تھی اور باطنی عمر اٹھارہ برس۔ شامو اور شامی بھی دیو تانکے حکم کے مطابق جموئیزے میں داخل ہوئے اور ایک طرف دوڑاؤ ہو کر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

دیو تانکی پھنکاریں جموئیزے میں گونج رہی تھیں۔

”اے ہمارے پاس لٹاؤ دشمنان۔“ دیو تانکھارا۔

سردار نے حسبِ ہدایت شاکی کو من کے پاس لٹا دیا۔ شاکی کا سر من کے پاس اور ٹانگیں دوسری طرف تھیں۔ دیو تانے اپنا لٹا ہوا اپنا شاکی کی طرف موڑ دیا۔ ایک بار زور سے لہرا کر پھنکار ماری۔ ایک بجلی سی کڑکڑاہٹ ابھری اور من میں سے روشنی کی لہر نکلی۔ سنہری روشنی کی لہر جس نے شاکی کے جسم کو اپنے حصار میں لے لیا۔ شاکی کپکپا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ شامی نے شامو کا شانہ دبا لیا۔ ماں تھی نا۔ دیو تانے ایک بار پھر زوردار پھنکار خارج کی اور روشنی کی لہر آگ کے شعلے میں بدل گئی۔ شعلے نے شامی کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کا جسم ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شعلے کا حجم آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ پھر اس شعلے میں دیو تان کا من بھی چھپ گیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ تب ایک زوردار پھنکار کی گونج سے وہ سب چونک پڑے۔ ان کی آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔

شعلہ بچھ چکا تھا۔ اب وہاں شاکی کی بجائے ایک نوجوان خوبصورت لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ ناگ دیو تان کا من اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ پھر آہستہ سے من ہلا لڑکی کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے من کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ من میں ناگ دیو تان پھنکار رہا تھا۔

لڑکی آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ناگ دیو تانکے سامنے سر جھک ہو گئی۔

”شاکی۔“ دیو تان پھنکارا۔

”دیو تان۔“ لڑکی کے ہونٹوں سے شیریں آواز نکلی اور شامو اور شامی نے حیرت

سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”شاکی! ان کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ انہوں نے سردار کی طرف دیکھا اور اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اثبات میں۔

”شاکی۔“ اصرار چلی جا۔ شامی یہاں آؤ اور شامو تو بھی۔“ دیو تانے اپنا پھنکارا ہونے حکم دیا۔

شاکی اٹھ کر پرے ہو گئی اور شامی اور شامو اس کے سامنے دوڑاؤ ہو کر بیٹھ گئے۔

”شامی۔ ہم جانتے ہیں کہ تو حیرت زدہ ہے لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ ہم نے تجھے ایک ہی نظریں ناخن کا روپ دے دیا تھا تو شاکی کو بدلتے ہمیں کیا دیر لگتی۔ پھر باطنی طور پر وہ ہے بھی اٹھارہ برس کی۔ ہم اسے اس کے اصلی روپ میں لے آئے ہیں۔“

”دیو تان۔“ شامی کچھ اور ہنس گیا۔

”تجھے اپنا کام مکمل کرنے میں کافی مشکلات پیش آئیں گی مگر ہمت نہ ہارنا۔ ہم ہر موقع پر تجھے ساتھ ہوں گے۔۔۔ پھر تجھے ایک قربانی دینا پڑے گی شامی۔“

”کیسی قربانی دیو تان۔“ شامی نے ادب سے پوچھا۔

”یہ وقت بتائے گا شامی لیکن تجھے بغیر کسی حیل و حجت کے وہ قربانی دینا ہو گی۔“

”دیو تان خوش رہے۔“ شامی نے اسی طرح جواب دیا۔

”اور اس قربانی کے وقت ہم خود تجھے پاس ہوں گے شامی۔“ دیو تان پھنکارا اور شاکی کے ایک ایک میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ خاموش رہی۔

”دیو تان میں کچھ کتنا چاہتی ہوں۔“ کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

”مکو شامی۔“ دیو تانکی پھنکار گونجی۔

”دیو تان۔“ گنگاشا نے ہستی میں پہنچ جانے کے بعد آج تک ہم پر کوئی وار نہیں کیا۔“

”وہ ایک ایسا دشمن ہے شامی جس پر مجھے غرہ ہے۔ اس کی دشمنی پر مجھے ناز



ہے۔ وہ صرف میرے بچاریوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ صرف اس وقت جب وہ میرے پاس سے کچھ لے کر جاتے ہیں۔ مجھے مل کر جاتے ہیں۔ میرے پاس آتے ہیں۔ اگر وہ تمہاری بستی پر حملہ آور ہو جاتا تو سینکڑوں لوگ بے گناہ مارے جاتے اور یہ بات نہ اسے پسند ہے نہ مجھے۔ ہماری دشمنی بے گناہوں سے نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے بچاریوں کو ختم کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معصوم اور بے گناہوں کو نہیں۔

”دیوتا۔ ایک بات اور؟“

”کو۔ دیوتا بھکاری۔“

”دیوتا۔ ہمیں باؤ کا پتہ۔۔۔“

”وہ تمہیں اسی پنگلے سے معلوم ہو جائے گا جہاں تم دلہن بن کر مگی نہیں اور ٹھوکریں مار کر نکال دیا گیا تھا۔“

”دیوتا۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔“

”اچھا میرے بچ۔ میرے بچاریو۔ ہم جا رہے ہیں۔ شوکا تمہاری حفاظت کرے گا۔“ ایک زوردار پتکار گونجی اور یکدم من کی ٹیلاہٹ ختم ہو گئی۔ پتھر کے پیالے میں شعلے بجڑ اٹھے۔

سردار نے آگے بڑھ کر سر اٹھا کر من کو پیالے میں رکھا اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ایک بار شعلے بجڑے اور پھر وہ من میں سامنے لگے۔ توڑی دیر بعد وہاں شعلوں کا نشان تک نہ تھا۔ سردار نے اسی طرح پیالے اور طشت کو اٹھا کر صندوق میں بند کر دیا اور مسکراتا ہوا ان کی طرف پلٹا۔

شاکی مسکرا کر ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاکی نے اپنے بازو پھیلا دیئے اور شاکی بھاگ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ ماں بیٹی معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ہم عمر سیلیاں لگتی تھیں۔ بالکل فرق نہ تھا ان میں۔ صرف حسن کی صورتیں الگ تھیں، جسم کے شیب و فراز بالکل یکساں اور جوانی سے بھرپور تھے۔ شاکی نے اس کے گال پر پیار کر لیا۔ سردار نے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیشانی پر پیار کر لیا۔ شاکی الگ کھڑا اسے مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ شاکی اس

کی طرف مڑی اور اس نے آگے بڑھ کر اس کی چوٹی پکڑ لی۔  
”ارے۔ اچھی کل۔ تو تو میری گود سے نہیں اترتی تھی اور آج شرم آ رہی ہے۔۔۔“

وہ منہ چمپا کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ شاکی نے اس کی پشت پر چھکی دی۔ وہ آہستہ سے الگ ہو گئی۔ وہ چاروں خوشی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے۔ قہقہے اٹھنے لگے۔ ہر غم ان کی زندگی سے دور بھاگ گیا۔

☆○☆

”تو شہر کے ہر رواج‘ ہر بات ہر جگہ سے واقف ہے۔ واقف ہے۔ اچھی طرح جانتی ہے۔“ سردار شاکی کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ آخر شاکی کی زبان سے بہت تھکی ہوئی آواز نکلی۔

”ہاں۔ میں ہر بات‘ ہر چیز‘ ہر جگہ‘ ہر رواج سے واقف ہوں۔“ تب سردار نے چند لہجوں بعد اپنا عمل ختم کر دیا۔ شاکی کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور جسم کی طاقت ختم ہو گئی۔ لیکن چند لہجوں بعد وہ اپنے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگی۔ اس نے مسکرا کر شاکی اور شاکی کی طرف دیکھا اور ان کی طرف بڑھ گئی۔

”اچھا بیٹی۔ کل تمہیں روانہ ہونا ہے۔ اب سو جاؤ۔“ سردار نے شاکی کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے بستر کی طرف بڑھ گئیں۔ شاکی‘ شاکی اور شاکی کل روانہ ہوئے والے تھے۔ شاکی اب مزید صبر نہ کر سکتی تھی۔ دیوتا اجازت دے چکا تھا۔ اب کسی بات کا انتظار اور کسی بات کی فکر نہ تھی۔

شاکی اپنے بستر پر لیٹا مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا ذہن ایک ہی گردان کر رہا تھا۔

وہاں کیا ہو گا؟ کیا ہو گا؟ لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔

اور ہر شاکی اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا چکی تھی۔ ایک خوفناک منصوبہ۔

شامی سوچتی تھی۔ اس نے ایک نظر اس کے من موہنے چہرے کو دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر لپٹ گئی۔ نچالے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆☆☆

”اچھا بیٹی دیوتا تمہاری حفاظت کریں۔“ سردار نے ایک بار پھر روتی ہوئی شامی کو زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ وہ والمانہ اس سے لپٹ گئی۔ کافی دیر بعد وہ اس سے الگ ہوئی۔ اب سردار نے شامی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کے آنسو روکنے نہ سکتے تھے۔ اس نے بے حاشا شامی اور شامی کو پیار کر لیا۔ آخر میں اس نے اپنے بازو شامی کی طرف پھیلا دیئے۔ شامو تیزی سے آگے بڑھا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ شامی اور شامی کی آنکھیں خشک ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

”شامو میرے بیٹے۔ میری شامی اور میری شامی کا خیال رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔“ سردار اس کے شانے پر سر رکھ کر بولا اور شامو بھی پھسل پڑا۔ شامو نے پوری قوت سے سردار کے جسم کو بھینچ لیا اور سردار نے بھی اسے پوری طاقت سے اپنے ساتھ چلا لیا۔

”سردار۔ میں اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کروں گا۔“

تب آہستہ سے سردار نے اسے اپنے سے الگ کر دیا اور ایک بار پھر اپنے دونوں بازوؤں میں شامی اور شامی کو سمیٹ لیا۔ پھر وہ ان کو شر جانے والی پگھڑی پر چھوڑ آیا۔ وہ کئی بار واپس جانے کا ارادہ کر کے ہٹتی کر چکا تھا۔ ”تھوڑی دور جا کر لوٹ آؤں گا۔“ وہ ہر بار یہ کہہ کر پھر ان کے ساتھ چلتے گلتے۔ ساری بستی افسروں کی حالت میں سر جھکانے ان کے پیچھے جھوم کی صورت میں آ رہی تھی۔ کوئی شور نہ تھا۔ کوئی آواز نہ تھی۔ صرف ہڈوں اور گھاس کی چرچاہٹ تھی جو ان کے پاؤں کے نیچے مسئلے جا رہے تھے۔ پھر سردار نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ شہر والی سڑک تھوڑی دور تھی اور آگے جانا ان کے لئے سودمند نہ تھا۔

سردار نے ایک بار پھر روتے ہوئے ان کو باری باری سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اس نے خون ہوتے ہوئے دل کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔ انہوں نے سڑک پر بہتی

دالوں کو اپنے ہم وطنوں کو دیکھا اور آج انہوں نے ان کو سلام کہا۔ بستی والے بے قابو ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ان کی شہزادیاں جاری تھیں۔ ان کی بستی کا غرور جا رہا تھا۔ ان کا سردار رو در کر بلکان ہو رہا تھا۔ کب تک برداشت کرتے اور تب وہ ان پر ایک بھرپور نظر ڈال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے الوداع کہتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

شامی کے قدم رک رک جاتے تھے۔ اس کا بی جاپا اہتمام کو چھوڑ چھاڑ کر واپس اپنے باپا کے پاس چلی جائے۔ اپنی بستی میں لوٹ جائے لیکن شامو نے اسے شانوں سے تمام کر سارا دیا تو وہ ہوش میں آگئی۔ اس نے اپنی شامی کی آنکھیں پونچھیں اور شامو نے شامی کی آنکھیں پونچھیں۔ وہ چلتے چلتے اس کے شانے پر سر رکھ کر رو دی۔ شامو نے اس کی کر کے گرد بازو مائل کر لیا اور حوصلہ دیا۔ شامی ان کے آگے آگے چلی جا رہی تھی۔

شامی اور شامی، شلوار فیضی میں لبوس تھیں۔ شامو ہاف آستین شرٹ اور چٹون میں بڑا خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر تکی جسم جنس مخالف کے لئے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ شامی اور شامی کا حسن افسروں کی حالت میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ وہ تینوں حسن کے مجتھے تھے۔ مکمل حسن کے نمونے! شامی اور شامی کے پاؤں میں زنانہ چپل تھے اور شامو کے پاؤں میں فلیٹ۔ یہ سب کچھ سردار نے انہیں میا کر دیا تھا۔ چلتے وقت سردار نے شامو کو کچھ روپے دیے تھے۔ تقریباً تین ہزار روپے۔ یہ پونچھنے اور تانے کا ہوش کسے تھا کہ سردار نے یہ کئی کئی کماں سے حاصل کی تھی؟ وہ چلتے رہے۔ بالکل خاموش کسی کا بھی بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ پھر وہ جنگل سے باہر آ گئے۔ ان کے سامنے ایک چمیل میدان پھیلا ہوا تھا۔ وہ میدان کے بعد ایک گھاٹی پار کرنے لگے۔ گھاٹی سے دوسری طرف شہر کو جانے والی سڑک تھی۔ یہی سیاہ تار کول کی سڑک۔ وہ رک گئے۔

سڑک کے دونوں طرف درخت اگے ہوئے گئے۔ گھنے درخت۔ وہ آہستہ آہستہ ان درختوں کے سامنے میں چلتے گئے۔

شامی سوچ رہی تھی کہ پہلے کہاں جائے؟ شہر یا باپا کے پچھلے پر۔۔۔ پھر اس

خوش اخلاق نوجوان موجود تھا۔ اب اس سے وہ شوکت کا پتہ معلوم کر کے شہر کی طرف چل پڑے۔

شاکی کچھ خاموش خاموش تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ یہ شوکت باہر کون ہے؟ اس نے شاکی سے پوچھا بھی لیکن وہ اسے یہ کہہ کر ٹال گئی کہ وقت آنے پر اسے خود ہی سب باتوں کا پتہ چل جائے گا۔ وہ چلتے ہوئے کافی دور نکل آئے۔ شہر ابھی دور تھا۔ شاکی بار بار مڑ کر دیکھنے لگتی۔ اسے کسی سواری کی تلاش تھی۔ بیدل شہر تک جاتے جاتے تو ان کا کچھ مرنکل جاتا۔ پھر ایک خالی ٹیکسی ان کے قریب سے گزری۔ شاکی نے جلدی سے ہاتھ دے کر روک لیا۔

”شہر جانا ہے۔ کسی ایچھے سے ہوٹل میں۔“ اس نے جبکہ کر کھڑی سے اندر جمائکتے ہوئے کہا۔ اس نے سیدھے کلب جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پہلے وہ اپنی صحن اتارنا چاہتے تھے۔

”بیٹھے۔“ ڈرائیور نے کہا۔

وہ دونوں پیچھے اور شاہو آگے بیٹھ گیا۔ سڑک بالکل سیدھی اور ٹریفک سے عاری تھی۔ ٹیکسی شہر کی جانب بھاگنے لگی۔ شوکت کی یادگار کو پیچھے چھوڑ کر اس کی جیتی جاگتی زندگی کی طرف۔۔۔ شاکی اوتھ گئی اور اس کا سر شاکی کے شانے پر ٹک گیا۔ اس نے تھوڑا سا سبیل کر اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑے سکون سے سو رہی تھی۔ شاہو نے سامنے گئے ہوئے آئینے میں ان کو دیکھا۔ شاکی سو رہی تھی اور شاکی کی آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ وہ مسکرا پڑا۔

پھر۔۔۔ ٹیکسی ایک ہینکے سے رک گئی۔ اوتھتا ہوا شاہو بھی چونک پڑا اور ایک خوبصورت ہوٹل کے وسیع کارلان میں نگاہیں دوڑانے لگا۔ ہوٹل بہت بڑا تھا اور اس کی خوبصورت اور دیو قامت عمارت ردشیزوں سے جنگا رہی تھی۔ عمارت کی پیشانی پر سرخ تیز میں ”شیا ہوٹل“ کے الفاظ چمک رہے تھے۔

”یہ شہر کسب سے خوبصورت ہوٹل ہے۔“ ڈرائیور نے اتر کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ شاہو نیچے اتر آیا اور سوئی ہوئی شاکی اور شاکی پر اسے پیار آگیا۔ اس نے آہستہ سے شاکی کا شانہ ہلایا۔ وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے باہر دیکھا۔

نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے شاہو کی طرف دیکھا اور شاکی کو آواز دی۔ وہ مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھیں سبھی ہوئی تھیں۔ شاکی کچھ اور کے بغیر اس راستے پر ہوئی جو باہر کے ہینکے کو جاتا تھا۔ وہ اس پر بیٹھنے چلے جا رہے تھے۔ چلے جا رہے تھے۔ ایک نئی منزل کی طرف! چند لمحوں بعد ان کا وجود شام کی سیاہی میں گم ہو گیا۔

☆○☆

”لیکن شوکت صاحب تو عرصہ ہوا یہ ہینکے ہمارے ہاتھ فروخت کر کے شہر جا چکے ہیں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”آپ کو ان کا پتہ معلوم ہے؟“ شاہو نے دخل اندازی کی۔

”جی۔۔۔ گھر کا پتہ تو نہیں البتہ ایک دوسری جگہ کا پتہ تاکہ سکا ہوں۔ وہ رہتا کلب میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ وہیں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ وہاں آپ کو ملیں گے یا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ شاکی نے مسکرا کر کہا۔

”جی۔ کوئی بات نہیں۔“ وہ آدمی گزیرا گیا۔ اس کی نظرس شاکی کی نظروں سے ٹکرائی تھیں۔

”لیکن یہ کلب ہے کہاں؟“ شاہو نے پھر پوچھا۔

”آپ شہر میں کسی بھی ٹیکسی والے سے کہہ دیجئے گا وہ آپ کو پچھا دے گا لیکن یہ کلب صرف رات کو کھلتا ہے۔“ وہ تفصیل سے بتاتے ہوئے بولا۔

”شکریہ۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاکی اس عرصے میں ڈرائیور کو روک کر جانزدہ لیتی رہی تھی جو نہایت فحاشت سے سجا ہوا تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ان کو دروازے تک چھوڑنے آیا۔ شاہو نے بڑی گرجوٹی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ شاکی اور شاکی کو سلام کہہ کر پھر اندر چلا گیا۔

وہ سیدھے شوکت کے ہینکے پر پہنچے تھے لیکن ہینکے میں اس کے بجائے ایک اور

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ ”اوہ ہوٹل۔۔۔“

”آسمیا۔“ شامو نے اس کی بات اچک لی۔ دونوں مسکرا پڑے۔ شامی نے شاگی کو جگایا اور وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر آگئی۔ شامو نے کرایہ ادا کیا اور وہ تینوں چھوٹے چھوٹے قدم لیتے ہوئے ہوٹل کے خوبصورت شیشے سے بنے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

انہوں نے دو کمرے لیے۔ ساتھ ساتھ۔ کمرہ نمبر ۳۲۱ اور ۳۲۲۔ شامو نے دو ہفتے کا کرایہ پیشگی دیا اور اپنے کمروں میں آ گئے۔ ایک کمرہ شامی اور شاگی کے لیے تھا اور دوسرا شامو کے لیے۔

کمرے بہترین ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ دیواروں پر عینیاں، کھڑکیوں پر نازک ریشی پردے لہرا رہے تھے۔ بہترین فرنیچر موجود تھا۔ ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی اور ہر کمرہ اٹھنڈا ہاتھ تھا۔ ٹیبل اور گرم دونوں شاور موجود تھے۔ فوم کے گلدے والے بستر، جن پر صاف و شفاف چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ بہترین کپل اور نرم اسفنج کے تکیے۔ ایک طرف الماری۔ غرض ہر لحاظ سے کمرہ آرام دہ تھا۔ کمرے میں سفید دودھیائیڈرو اپنی ٹھنڈی روشنی بکیر رہی تھیں۔ ہر کمرے میں دو بستر موجود تھے اور ہر بستر کے سرہانے کال بتل گلی تھی۔ بستر کے پاس چھوٹی سی تپائی پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ شامی اور شاگی آتے ہی بستر پر گر پڑیں۔ شامی نے شامو کو بھی آرام کرنے کو کہا اور وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ شاگی کے پاؤں سے تو چپل بھی شامی نے اتاری تھی۔ پھر وہ جلدی بینک کی دھند آلود وادیوں میں گم ہو گئے۔

☆☆☆



صبح ہو چکی تھی۔ وہ ابھی تک بے سادھ پڑی تھیں۔ ڈور بتل کافی دیر سے اپنی تیز آواز سے کمرے کے سکوت کو درہم برہم کر رہی تھی۔ شامی دو تین بار کسمائی، پھر کوٹ بدل کر سو گئی لیکن جب کئی بار کھٹکی کی آواز نے اس کی نیند خراب کی تو وہ جھلا گئی۔ بستر سے اتر کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ شاگی ابھی تک سو رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ باہر شامو کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ سرخ ہوئی ہوئی آنکھیں، لال بھجوا کا چہرہ اور پیچھے ہوئے ہونٹ، ایک دلنشین مسکراہٹ میں بدل گئے۔

”اوہ تم۔۔۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر دروازے سے ہٹ گئی۔ شامو مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ وہ نما کر آیا تھا اور شامی کی نظریں سرتاپا اسے گھور رہی تھیں۔ اس کا مضبوط جسم چست کپڑوں میں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ہلکے ہلکے سرخ ڈورے تھے اور بال ترتیب سے جھے ہوئے تھے۔ وہ شاگی کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ ابھی تک سو رہی ہے۔“ اس نے شاگی کی ناک پر چٹکی لی۔ وہ اچھل پڑی۔ اس نے جلدی سے اپنی ناک پر جھے ہوئے شامو کے ہاتھ کو تھام لیا اور پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ شامو نے اس کی ناک چھوڑ دی۔

”اے۔۔۔“ وہ پیار سے آنکھیں نکالتا ہوا بولا۔ ”اٹھنا نہیں؟“

”اوں۔۔۔“ وہ دوسری طرف کوٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

”ارے۔۔۔“ وہ اس کے پاس بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی چوٹی پکڑ لی اور اسے اٹھا کر بستر پر بٹھا دیا۔

”ہائے۔۔۔“ وہ جیج پڑی۔ ”چھوڑو۔ ہائے ماں۔ چھڑاؤ ناں۔“ وہ بے بسی

سنواریں اور اسی اثا میں شامو نے انٹرکام پر ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہیرا ایک بڑی ٹرے میں چائے، 'ٹوس' مکین وغیرہ لے آیا لیکن یہ صرف ایک آدمی کا ناشتہ تھا۔ شاکی نے ایک آدمی کا ناشتہ دیکھ کر شاکی کی طرف دیکھا لیکن پھر اسے شامو کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہ ہیرے سے مخاطب تھا۔  
"دودھ مل سکتا ہے؟" اس نے ہیرے سے پوچھا۔

"جتنا چاہیں سر۔" اس نے ادب سے کہا۔  
"بس تو ایک جگہ دودھ لے آؤ۔" اور ہیرا سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ شاکی کا سانس میں سانس آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہیرا دودھ لے آیا۔ پھر ناشتے سے فارغ ہو کر وہ سارے دن کا پروگرام بتانے لگے۔

"کلب تو شام کو کھلے گا۔ سارا دن پڑا ہے۔"  
"میرے خیال میں پہلے شرکی کچھ سیر کر لیں۔ کچھ کپڑے خریدے جائیں اور پھر شام تک آرام کیا جائے۔ شام کو کلب چلا جائے۔" شاکی نے پروگرام بنایا۔  
"کپڑوں کے ساتھ ساتھ ایک عدد گھڑی بھی، وقت دیکھنے کے لیے لے لی جائے تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" شاکی نے کہا۔  
شاکی شرکی سیر کے تصور سے ہی خوش نظر آئے گی۔ وہ کمروں کو لاک کر کے نچے اترے۔ چھاپان کی پورٹر لٹکائیں اور باہر نکل گئے۔ ایک عجمی لی اور شرکی سیر کو روانہ ہو گئے۔

☆○☆

سہ پہر کے قریب جب وہ ہوٹل میں داخل ہوئے تو ایک پورٹر دو بڑے بڑے بیکٹ اٹھائے ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ بیکٹ کمرے میں رکھ کر پورٹر چلا گیا اور وہ جھکے جھکے سے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے شہر کے تقریباً تمام مشہور مقامات دیکھ ڈالے تھے۔ شاکی بڑی دلچسپی سے بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں، خوبصورت تفریح گاہیں دیکھتی رہی۔ والیبا پر انہوں نے کئی چیزیں خریدیں۔ شاکی اور شاکی کے لیے تین تین ریڈی میڈ شلوار سوٹ، شامو نے اپنے لیے دو پتلونیں اور دو شرٹیں

سے شاکی کی طرف دیکھ کر بولی جو اپنے بستر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"نہ بابا۔ خودی ننہو۔" وہ کالوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"بستر سے نیچے۔" شامو نے چوٹی کو ذرا سا کھینچ کر کہا۔

"اچھا۔ پہلے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ چچا۔" وہ جھج پڑی اور اسی طرح نیچے

اتر آئی تب شامو نے اس کی چوٹی چھوڑ دی اور وہ اپنا سر دبائے گی۔

"ماں بھی تو بستر ہے۔" وہ منہ بسورے ہوئے بولی۔

"تو ہم اس کا کب لحاظ کریں گے۔" وہ شاکی کی طرف بڑھا اور وہ ہنستی ہوئی

جلدی سے بستر سے اتر آئی۔ "نہ بابا۔ میں خودی اتر آتی ہوں۔" اور شامو مسکراتا

ہوا رک گیا۔

"چچا۔ بھوک لگی ہے۔" شاکی پجاری کی سے بولی۔

"پہلے نماز پھر ناشتہ لے گا۔" وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔

لیکن اس وقت تک شاکی غسل خانے میں جا چکی تھی۔ اب اندر سے پانی

مرنے کی آواز آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد شاکی نما کر باہر نکل آئی اور شاکی جلدی سے غسل خانے کی

طرف بڑھ گئی اور شامو۔۔۔۔۔ شاکی کے بکھرے ہوئے حسن میں کھو گیا۔ اس کے

تکیے بالوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ پانی کے قطرے اس کے گورے

گورے گالوں پر ٹھہرے کو ترس رہے تھے لیکن ملائم۔۔۔۔۔ مکین سے نرم

رخساروں پر ان کا ٹھہرنا ممکن دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ توتلے سے بال خشک کرنے لگی

اور پھر شامو کو پیار بھری نظروں سے اپنی طرف دیکھنے پر کاکر شامو گئی۔ شامو آگے بڑھا

اور اس نے اس کا نرم و گداز جسم اپنے بازوؤں میں سمیٹا چھاپا۔

"ارے۔۔۔۔۔" اس نے غسل خانے کی طرف دیکھ کر کہا اور شامو رک گیا اور

وہ مسکراتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے سٹیمار کی کسی چیز کو ہاتھ

نہ لگایا۔ بس برش سے اپنی سیاہ، لالچی اور ریشمی زلفوں کو سنوار کر اٹھ کھڑی ہوئی

۔۔۔ اور اسی وقت شاکی باہر نکل آئی۔

وہ بھی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے بھی صرف اپنی زلفیں

سوچنے لگی۔ ”تم تاؤ۔“ کچھ دیر بعد وہ پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔  
اور شامو نے بولے سے فس کر مٹی کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر عطر کی شیشی  
اور تہہ کیا ہوا سرخ ربیڑی رومال تھا۔  
”ارے۔۔۔“ شامی نے اس کی ہتھیلی سے دونوں چیزیں اٹھالیں۔ اس نے  
رومال کو چوم کر آنکھوں سے لٹالیا۔ پھر شیشی کھول کر سونگھنے لگی اور اس پر نشہ سا  
چھایا۔ وہ دھواش ہو کر شامو کے سینے سے آگلی جیسے اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی  
ہو۔

”شامو۔“ وہ بولے سے بولی۔

”ہوں۔“ آنکھیں بند کر کے اس نے اسے خود سے لپٹالیا۔

”یہ خوشبو۔۔۔۔“

”میں جانتا ہوں شامی۔ جان بوجھ کر خریدی تھی۔“ اس نے اس کی بات کاٹ  
دی۔ ”موتے کی خوشبو ناگ ہو یا ناکن“ اسے دھواش کر دیتی ہے۔ موتے کے  
پودے میں ضرور سناپ ہوتا ہے۔“

شامی نے ایک بار پھر شیشی کو ناگ کے قریب لپکا کر سونگھا اور بالکل ہی ہوش  
کھو بیٹھی۔ شامو نے آہستہ سے اس کے ہاتھ سے شیشی لے کر بند کی اور میز پر رکھ  
دی۔ ”شامی“ ان کو حفاظت سے رکھنا۔“ اس نے اپنے ہونٹ اس کی سیاہ زلفوں پر  
رکھ کر دونوں بازوؤں میں اسے سمیٹ لیا۔

”یہ میری زندگی کا خزانہ ہیں شامو۔ میں ان کو اپنی جان سے عزیز رکھوں گی۔  
اپنے دل میں۔۔۔۔“ اس نے نئے نئے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شامی۔“

”شامو۔“

دو سرگوشیاں ابھریں اور۔۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زور سے لپٹالیا  
۔۔۔۔ لیکن ان کا پیار بیٹیں تک محدود تھا۔ آج تک وہ اس سے آگے نہ بڑھے  
تھے۔ روح کی گھرائیوں سے ان کے جذبات کا طوفان اٹھتا اور وہ ایک دوسرے میں  
مغمم ہو جاتے لیکن صرف اسی حد تک۔۔۔۔ آج تک شامو نے شامی کے لبوں کو

ایک لمبا اور کوٹ، ایک ہیٹ اور ایک سیاہ رومال خریدا۔ ایک لیڈی رسٹ واچ  
اس نے خریدا کہ اپنے ہاتھوں سے شامی کی کلائی پر باندھ دی۔ نرم و نازک گوری  
گوری کلائی پر خوبصورت رسٹ واچ۔ شامی کو اس نے کانوں کے لیے آویڑے  
خرید کر دیے۔ ایک جگہ سے اس نے ایک بہت خوبصورت چھوٹا سا ربیڑی رومال  
خریدا اور موتے کے عطر کی ایک شیشی بھی خرید لی۔ اس نے یہ دونوں چیزیں شامی  
کو ابھی تک نہ دی تھیں۔

شامو نے اپنے آگے پڑے ہوئے دونوں پیکٹ کھولے اور اپنی چیزیں الگ کر  
لیں۔ شامی اور شامی نے اپنی چیزیں الماری میں رکھ لیں۔ شامی کے کانوں میں  
نازک آویڑے بڑے دل آویڑ معلوم ہو رہے تھے۔

شامی بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مری نیند سو رہی تھی۔ سب تھکان  
محسوس کر رہے تھے۔ شامی موتے پر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ شامو نے اٹھ کر  
جیب میں ہاتھ ڈالا اور رومال اور عطر کی شیشی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے  
ہاتھ میں دونوں چیزیں لے کر ہاتھ پیچھے کر لیا اور شامی کے نزدیک جا بیٹھا۔ شامی نے  
کسی کو قریب محسوس کیا تو آنکھیں کھول دیں۔ شامو بڑے پیار سے اس کی طرف  
دیکھ رہا تھا۔

”شامی۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور شامی نے آہستہ سے اپنا سر اس کے  
شامے سے ٹکا دیا۔ شامو نے دوسرا ہاتھ اس کے دوسرے شامے پر رکھ کر اسے  
اپنے ساتھ لٹا لیا۔

”شامی۔“ وہ بولے سے بولا۔

”ہوں۔“ اس نے عجیب سے سرور میں آنکھیں بند کر لیں۔

”میری طرف دیکھو۔“

اور شامی نے سر اس کے شامے سے اٹھا کر چہرہ اس کی طرف مٹھا دیا۔ دونوں  
کی نظریں ملیں۔ چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر شامو نے بند  
مٹی اس کے آگے کر دی۔ ”تاؤ“ اس میں کیا ہے؟“ وہ سگرایا۔  
شامی نے پر اشتیاق نظروں سے اس کی مٹی کو دیکھا۔ وہ سگراتے ہوئے کچھ

بوسہ نہ دیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ شامی کے سارے جسم میں ذہر تھا اور وہ ابھی خود شامی کے مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اسی لمحہ ابھی تک وہ اور شامی اسی حد تک رہتے تھے۔ بارہا جذبات نے سرکش ہو کر سر اٹھا لیکن انہوں نے سختی سے ان کا سر کیل دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک وہ ان کا ملاپ ضرور ہو گا۔ اسی لیے وہ خود پر قابو پالیتے تھے۔ اسی امید کے سارے وہ پیار کی خنریں ملے کئے چلے جا رہے تھے۔

☆○☆

لیکھی ”رنگِ کلب“ کے وسیع و عریض لان میں رک گئی۔ وہ تینوں اتر پڑے۔ شامو نے کرایہ ادا کیا اور وہ ساتھ ساتھ چلے ہوئے کلب کے پیشے سے بنے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

کلب کی خوبصورت عمارت جدید فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ بالکل گول عمارت تھی جیسے پالائے اوندر حارکہ دیا گیا ہو۔ کلب کی عمارت کا تین چوتھائی حصہ پیشے کا بنا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنیوں کا غاصب مارتا ہوا سمندر تھا۔ وہ پیشے کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ صاف ستھری درودی میں لمبوس دربان نے جلدی سے سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی راہداری تھی اور اس کے بعد پیشے کا گھومتا ہوا دروازہ۔ وہ دروازے کو سمجھا کر کلب کے ہال میں داخل ہوئے اور ان کی آنکھیں حیرت سے کھلیں کی کھلی رہ گئیں۔ کلب تھا یا جنت۔۔۔ دیواریں، موئے پیشے کی بنی ہوئی تھیں اور ان سے قوس قزح کے رنگ پھوٹ رہے تھے۔ چھت پر لٹکے ہوئے بڑے بڑے فانوس کئی رنگ کی روشنیاں نکھیر رہے تھے۔ دروازے کے بائیں ہاتھ کاؤٹر تھا جہاں ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے بڑی بڑی الماریوں میں شراب کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں۔ بائیں ہاتھ کین بنے ہوئے تھے جن کے دروازوں پر خوبصورت اور ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ ہال انٹریڈیو تھا اور گرم تھا۔ سردی بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

کینوں کی ایک لمبی قطار ہال کے دوسرے سرے تک چلی گئی تھی۔ ہال کے

پیشے کی بنی ہوئی دیواروں سے کئی دروازے نکلتے تھے۔ ہر دروازے پر اس نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی جس طرح دروازے سے گزر کر جانا تھا تھا۔ ہال میں خوبصورت میزوں اور کرسیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ہر سروسریشی گھائی نیم عریاں بدن لہرا رہے تھے۔ حقے گونج رہے تھے۔ کاؤٹر کے اگلے حصے میں ڈانس فلور پر گورے اور نازک جسم مردوں سے لپٹے ہوئے وحشانہ رقص میں غرق تھے۔ ان کے جسم آپس میں چپکے ہوئے تھے۔ ہر لڑکی کا ہاتھ لڑکے کے کانڈے پر اور ہر لڑکے کا بازو لڑکی کی پتلی کر کے گرد حائل تھا۔ ان کے چہرے بے حد قریب تھے۔ لڑکیوں کے جسم آدھے آدھے ننگے تھے۔ ان کی پنڈلیاں اور کندھوں تک بازو صاف نظر آرہے تھے۔ کئے ہوئے کپڑوں میں ان کے جسموں کے دل آویز خطوط نمایاں ہو رہے تھے اور جو ساڈھیوں میں لمبوس تھیں ان کے آدھے آدھے پیٹ، گورے، کالے، سانولے پیٹ برہنہ تھے۔

”اس طرف سر۔“ ایک ہیرے نے ان کے قریب آکر ادب سے سر جھکا کر ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔ ہم کینیں میں جا رہے ہیں۔ تم کچھ ٹھنڈا لے آؤ۔“ شامو نے وہیں کھڑے کھڑے آرڈر دیا اور ایک کینیں کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ لیکن اس کو پوچھا کر پیچھے ہٹا پڑا۔ ان کے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔

”ایڈیٹ۔“ اندر سے ایک زنانہ آواز ابھری اور وہ جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ اب وہ کیسے کہتے کہ اندر ایک جوڑا رازدینا میز میں مصروف تھا۔

اگلا کینیں خالی تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور اطمینان بھری سانس لی۔ شامو نے جلدی سے پردہ برابر کر دیا اور شامی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بیزارگی کے اثرات نظر آرہے تھے۔ شامی کا چہرہ بھی اسی قسم کے جذبات کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نظریں ہٹائے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

اسی وقت ہیرے نے کینیں سے باہر کھڑے ہو کر تیل دی۔

”آ جاؤ بھئی۔“ شامو نے سر کو کرسی کی پشت سے اٹھا کر کہا اور ہیرا اندر داخل

ہوا۔

اچھا خاصا نوجوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ چہرے مہرے سے پڑھا لکھا اور سفید وردی میں اس کا گھٹا ہوا جسم خاصا جاذبِ نظر لگتا تھا۔ وہ بڑے میز پر رکھ کر سر جھکا کر باہر نکل گیا لیکن شامی اور شاکی تو صرف دودھ پیتی تھیں۔ تینوں گلاس شامو کو پینے پڑے۔ اس نے تھوڑی دیر بعد خالی گلاس بڑے میں رکھ دیے۔

رومال سے ہونٹ صاف کر کے وہ اپنی سیٹ کی پشت سے نکلیا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔ شامو اور شاکی! اس بے حیائی کو سوچ کا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ ان کی بستی میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں تو کسی کی نظر کسی سے مل جاتی تو قیامت آ جاتی، لیکن یہاں --- یہاں تو وہ سرعام بے حیائی اور بے شرمی کا لبادہ اوڑھے ایک دوسرے سے لپٹے ناچتے ہیں۔

اور شامی --- وہ شوکت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کہیں اس نے یہاں آنا نہ چھوڑ دیا ہو۔ اگر وہ اسے یہاں نہ ملا تو وہ اسے کہاں تلاش کرتی پھرے گی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے کال بیل دبا دی۔

”ہیں۔“ وہی ویڈیو جن کی طرح آ موجود ہوا۔

”سنو۔“ شامی نے کہا اور وہ اس کی طرف جھک گیا۔

”یہاں کوئی شوکت نام صاحب آتے ہیں؟“ اور شامو اور شاکی چونک کر سیدھے ہو گئے۔

”شوکت صاحب۔“ وہ چونک کر سیدھا ہو گیا جیسے کسی نے اسے سوئی چھو دی ہو۔

”ہاں۔“ شامی نے سر ہلایا۔

”جی ہاں، ایک صاحب آتے تو ہیں اسی نام کے، لیکن آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ شامی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم یہ بتاؤ وہاں کس وقت آتے ہیں؟“ شامی نے بے صبری سے پوچھا۔

”وہ رات کو دس گیارہ بجے آتے ہیں اور بہت دیر سے جاتے ہیں۔“ وہ ادب سے بولا۔

”ہوں۔“ شامی نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

”اچھا! ایسا کرو جب وہ آئیں تو ہمیں بتا دینا لیکن ان کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ یہ لو تمہارا انعام۔“

بیرا دس کا نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس کر بولا۔ ”ہیں میڈم۔“ اور شامی کا اشارہ پا کر چلا گیا۔ شامی نے وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ ہو چکے تھے۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

شامی نے شامو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟

”ابھی بہت وقت ہے شام، کیا خیال ہے یہاں بیٹھیں یا باہر چلیں۔“ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”یہیں بیٹھتی ہیں۔ کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔“ شامو نے شام کی پیار بھری مٹھاس کو محسوس کیا اور سرور میں کہو گیا۔

”سنو! آج سے تم شام اور شاکی تم ملتی ہو۔“ اس نے دونوں سے کہا۔ شامو نے آنکھیں بند کئے کئے سر ہلایا لیکن شاکی نہ رہ سکی۔

”وہ کیوں ماں، ہمارے نام کیوں ---“

”جو کہا ہے اسے ذہن نشین کرو بیٹی۔ بحث مت کرو۔“ اس نے پیار سے اس کی بات کاٹ دی اور وہ نظروں میں کئی سوال چھپائے کرسی کی پشت سے نکلی گئی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔ شامو آنکھیں بند کیے شاکی کے لہجے کی مٹھاس میں کھویا ہوا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا دیکھے جا رہا تھا --- اور شامی --- اس کی آنکھوں میں انتقام کی چمک نمایاں تھی۔

”مر۔ شوکت صاحب آچکے ہیں۔“ سب نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

”اوہ۔“ شامی کا دل بلبلوں اچھلنے لگا۔

”کس جگہ ہیں وہ؟“ اس نے بے صبری سے اٹھ کر کہا۔

”وہ۔۔۔“ کاؤنٹر کے بائیں طرف سے ساتویں میز انجی کی ہے۔“ ویڈیو پر وہ ذرا سا سرکار کا اثر کارہ کیا۔



شامو بھی آگے جھک آیا۔ شاکی بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی اور شاکی کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ شوکت کا چہرہ اس کی نظروں کے بالکل سامنے تھا۔ پلکے لمبے رنگ کے سوٹ میں لبوس تھا۔ اس کا پیشہ تروتازہ رہنے والا چہرہ اس وقت بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ پرکشش نظر آ رہا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پر جنس مخالف کے لیے خاصی کشش تھی۔ اس کے ساتھ ایک حسین اور بھرپور جسم والی لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ جس فہم کر باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کو دیکھ کر شاکی کے دل میں شک نے سراٹھایا۔

”یہ لڑکی شوکت صاحب کی بیوی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بیوی۔ جی نہیں۔ چند دن کی مہمان ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسری لڑکی اس کی جگہ لے لے گی اور اسی طرح یہ پکر چلا رہے گا۔ ایک کے بعد ایک۔۔۔“ ویٹر کھڑے لمبے میں مسکرا کر بولا۔

”ہوں۔“ نفرت سے شاکی کی بنویں تن گئیں۔ ”اور وہ پہلی لڑکیاں؟“ وہ سوالیہ لمبے میں بولی۔

”اپنی عزت سب کو بیاری ہوتی ہے میڈم۔“ وہ شائے اچکا کر بولا۔

شامو اس دوران خاموشی سے شوکت کو دیکھتا رہا۔ اس کے معصوم چہرے کو نکلتا رہا۔ جو جنس مخالف کے لیے پرکشش تھا۔ لیکن ہر کھلی پھول بننے کے بعد ہی جان سکتی تھی کہ اس معصوم چہرے کے پیچھے شیطان سے زیادہ ہمایاک اور مکروہ چہرہ ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ جب وہ ہنسبیلی جب تک وہ خود کو چنگ کی حالت میں ہوتی اور مجبوراً اسے زبان بند رکھنا پڑتا۔ دوسری صورت میں شوکت کا کیا جانا؟ خود اس کی زندگی جہنم بن جاتی۔ نہایت وہ کتنی معصوم جوانوں کو اپنی خواہشات کے مندر میں ہوس کی سمیٹ چڑھا چکا تھا اور ابھی نچائے کتنی اور کھیاں اس بنسورے کے ہاتھوں مر جھانے والی تھیں۔

”تم اور کیا جانتے ہو اس کے بارے میں؟“

”مجھ سے زیادہ انہیں کون جانتا ہو گا میڈم۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تمہاری ڈیوٹی کتنے بجے ختم ہوتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”رات ایک بجے۔ اس کے بعد میں ہر روز چار بجے سہ پہر تک فارغ ہوتا ہوں۔“ وہ گہری نظروں سے انہیں دیکھتا ہوا بولا۔

”تم کل مجھے شیوا ہوٹل میں لو۔“ منجوس بیچے۔ ”اس نے اسے اپنے کمرے کا نمبر بتایا۔

”آئے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں میڈم۔۔۔ لیکن یہ معاملہ کیا ہے؟“ وہ شک بھرے لمبے میں بولا۔

”کل جہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ شاکی نے بات ختم کر دی۔

”یہ رکھ لو۔“ اب کے شامو نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف پڑھایا۔

”ارے صاحب۔۔۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔“ اس کے باوجود اس نے نوٹ جھپٹ لیا۔ اس کی نظریں بار بار شاکی کی طرف اٹھ باتیں جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اچھا تو کل دس بجے۔ یاد رکھنا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں ضرور آؤں گا میڈم۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

”لیکن اس بارے میں کسی کو۔۔۔“

”آپ بے فکر رہیں صاحب۔ ہمارے سینے آپ ایسے ہی ریمیسوں کے نیٹکوں رازوں کے امین ہیں۔“ اس نے شامو کی بات کاٹ دی اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس کی نظریں پھر شاکی کی نظروں سے ٹکرائیں۔

شاکی نے شوکت کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے لڑکی سے باتوں میں مشغول تھا۔ اس کی نظروں میں نفرت بیزاری اور جوش کے طے پلے تاثرات ابھرے اور آہستہ سرخ ہوئے لگیں۔

وہ آہستہ سے باہر نکل آئے۔ شوکت ویٹر کو آرڈر دے رہا تھا، اسی لیے وہ اس کی نظروں میں نہ آئے۔ ویسے بھی ان کے کیمین اور شوکت کی میز کے درمیان بہت سی میزیں حائل تھیں۔ وہ ان کو نہ دیکھ سکتا تھا۔

وہ ویٹر ان کے لیے ٹیکسی لے آیا اور وہ اپنے ہوٹل روانہ ہو گئے۔ ویٹر نے

جبکہ کران کو سلام کیا اور اس کی نظرس ایک بار پھر شامی کی طرف اٹھ گئیں۔ شامی بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
جیسی کلب کے کپڑاؤں سے باہر نکل گئی۔

☆○☆

اس کا نام آصف تھا۔ بی اے پاس تھا لیکن ملازمت، وہ اسے شانہ ساری زندگی نہ ملتی۔ ایک بوڑھا باپ تھا اور بس۔۔۔ نہ کوئی رشتہ دار نہ بہن بھائی۔ ماں بچپن میں ہی مر چکی تھی۔ اس نے درپردہ کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے دو سال گزار دیے۔ پھر اس نے تنگ آ کر بھرہ گیری کر لی۔ شہر کا سب سے بڑا اور مشہور کلب تھا۔ تنگ کلب، بے حیائی اور بے شرمی کا ڈھ، لیکن وہ کسی گندگی میں نہ پھنس سکا۔ اپنے باپ کی نیک تربیت کی بدولت۔ چار ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور لوگوں کی دی ہوئی ٹپ الگ۔ ٹپ ہی سے اسے تین چار ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس نے کبھی کسی سے مانگ کر ٹپ نہ لی تھی۔ لوگ خود ہی دیتے تھے۔ اس لیے کہ۔۔۔ اس کے سینے میں کلب کے تقریباً آدھے سے زیادہ ممبروں کے ایسے ایسے راز دفن تھے جو اگر اس کی زبان پر آجاتے تو وہ خود کشی کر لیتے لیکن اس نے کبھی کسی کو بلیک میل کرنے کا ذیل خیال ذہن میں نہ آنے دیا۔ شوکت کے بارے میں وہ ایک ایک بات جانتا تھا کیونکہ اس کی اکثر باتیں کلب میں ہی گزرتی تھیں اور اس کا خاص و غیر آصف ہی تھا۔ وہ جنس پسند واقع ہوا تھا۔ ذرا راسی بات کا کھوج لگانا اس کی عادت بن چکی تھی لیکن اس نے کبھی کسی کے معاملے میں ناگ اڑانے کی کوشش نہ کی تھی۔ اسے جو بات معلوم ہو جاتی وہ اسے اپنے دل میں محفوظ کر لیتا۔ پھر اس بات کا اس کے لبوں پر آنا تقریباً ناممکن ہو جاتا، حتیٰ کہ نوبت نازک مرحلے کی آخری حد تک نہ پہنچ جائے۔

اپنی اسی جنس عادت کی وجہ سے اس نے ان تین پر اسرار خستہوں سے بھی ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر سب سے بڑی وجہ تو وہ خوبصورت سی نازک اندام، معصوم لڑکی جی جس کی سادگی نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ وہ اس کی جمیل سی آنکھوں میں وہ ب جانا چاہتا تھا۔ اس کی سیاہ لائبریشی زلفوں میں اپنا چہرہ چھپا کر اپنے تمام دکھ

بھول جانا چاہتا تھا۔ اسے جیون ساتھی کی تلاش تھی اور اس کا تصور آج زندہ حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کی ویران زندگی میں، ہماری ہمار ٹھکر مٹی تھی۔ کلب کی ویٹرس اور ممبر خواتین نے اس کے جوان جسم کو بڑی ہوسناک نظروں سے دیکھا تھا۔ بارہا وہ بچے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آ گری تھیں لیکن اس کا مضبوط کردار اسے پتیوں میں گرنے سے صاف بچالے گیا۔ اس کے قدموں میں ذرہ بھر لڑکھاڑٹ نہ آئی اور تب وہ غصے سے ہونٹ کاٹتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

وہ شامی کے بارے میں سوچتا ہوا اندر آیا اور کلب کی روشنیوں نے اسے اپنے اندر چھپایا۔

☆○☆

”۔۔۔ اور اب میں اس سے کیا ہوا اپنا وعدہ بھانے آئی ہوں۔۔۔ انتقام کا وعدہ۔“ شامی کی آنکھیں شعلے اٹکنے لگیں اور آصف نے گھبرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

شامی نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ شوکت نے اسے اپنی بیوی بنانے کے بعد اس پر کیا کیا ظلم کیے۔ پھر اسے اپنی بیوی ہونے کے حق سے بھی محروم کر دیا اور ٹھوکریں مار کر گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے قبیلے میں واپس چلی گئی اور وہ اب اس سے انتقام لینے آئی ہے۔ کیونکہ وہ جاتے وقت شوکت سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ اس سے انتقام لے گی۔

آصف کے دل میں شامی کے لیے ہر دوری کے جذبات ابھر آئے۔ اس نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شوکت جیسے بدکردار شیطان کو سزا دینا گناہ نہیں، ثواب کا کام تھا۔

”تو کیا آپ اسے جان سے مارنا چاہتی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

شامی نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”نہیں۔ میں اسے زندگی سے دور بھاگنے پر مجبور کر دوں گی۔ وہ مرنا چاہے گا لیکن مرنے کے گاہ۔ وہ جینا چاہے گا لیکن زندگی اس سے دور کھڑی قہقہے لگاؤں گی۔“ شامی نے پر اسرار لہجے میں کہا اور

ہوٹ بھیج لے۔ آصف سوچ میں ڈوب گیا۔

شامو اور شامی ان کی منتظر بڑے اطمینان سے سن رہے تھے۔ شامی اور آصف کی نظریں کئی مرتبہ کھرا پکی تھیں۔ شامی نے آصف کو اپنے طریقہ انتقام کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

”ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ شامی رک گئی۔

آصف نے چونک کر سر اٹھایا اور چند لمحوں بعد وہ آہستہ سے بولا۔ ”میں تیار ہوں، آج سے مجھے بھی اپنا ساتھی سمجھئے۔“

”شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔“ شامی خوشی کے مارے کھل گئی اور شامی کے دل میں ایک نیٹھا شخارو دو ہونے لگا۔ نیٹھے کیسا درد تھا کہ اس نے سرور میں آکر آنکھیں بند کر لیں۔

”آپ کے اصل نام تو مجھے معلوم ہو گئے لیکن یہاں آپ نے کیا نام رکھے ہیں؟“ آصف نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں بتاتی ہوں۔“ شامی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور آصف نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف چہرہ کر لیا۔

”فرمائیے۔“ وہ بولا۔

”پہلے آپ اپنا نام تو بتائیے۔“ وہ معصوم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولی اور آصف نٹے میں ڈوب گیا۔

”میرا نام آصف ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”آصف۔“ شامی نے دہرایا۔ شامو اور شامی نے ان کو دلچسپی سے دیکھا۔

”تو جتنا۔“ وہ تقریر کے سے انداز میں بولی۔ ”یہ ہیں میرے چچا شام۔“ یہ ہیں میری مئی ناز۔۔۔۔۔ اس نے اپنے خور خور شامی کا نام تجویز کر دیا۔ ”اور میں۔۔۔۔۔ میرا نام ہے سلی۔“ وہ سر جھکا کر بولی اور سب ہنس پڑے۔

”آپ ان کی بیٹی ہیں؟“ آصف حیرت سے بولا۔

”آپ کو شک ہے؟“ وہ بولی۔

”ورا اصل آصف صاحب۔ یہ ایک راز ہے جو وقت آنے پر خود بخود سامنے آ

جائے گا۔“ شامی نے کہا اور آصف سر ہلا کر رہ گیا۔

”چچا۔ تو اب مجھے اب اجازت دیجئے۔“ آصف اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھے۔“ تھوڑی دیر اور۔۔۔۔۔“ شامی نے کہا۔

”جی نہیں۔ اب شام کو کلب میں ملاقات ہوگی لیکن اب آپ کا پروگرام کیا ہے؟“ وہ شامی اور شامو کی طرف پٹا۔

”شام کو کلب میں بتائیں گے۔“ شامو اٹھ کھڑا ہوا۔

آصف ان کو سلام کر کے اور شامو سے بڑی گرجو شجی سے ہاتھ ملا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا اور شامی کی نظریں دروازے تک اس کا تعاقب کر کے لوٹ آئیں۔ شامی، گہری نظریں سے شامی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ شامی اور آصف ایک دوسرے کو پسندیدگی کی نظریں سے دیکھنے لگے تھے۔ شامی آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹک گئی۔ شامی نے شامو کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور وہ خود بھی ایک طویل سانس لے کر سوچوں کے اقیانوس میں ڈوب گئی۔

آصف کی مہیا کردہ مطلوبات کے مطابق۔۔۔۔۔ شوکت ایک ایسا بھورا تھا جسے ہر چند دن بعد ایک نئی لڑکی کی خواہش ہوتی اور اپنی یہ خواہش وہ آسانی سے پوری کر لیتا تھا۔ ماڈرن تہذیب کا دلدادہ تھا اور اس تہذیب کے غلیظ اثرے اس کی یہ تنہا بے مبرم پوری کر دیتے۔

تمام تمام انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اس طرح وہ کئی معصوموں کو بھی تباہ کر چکا تھا۔ وہ اب تک نیٹھے کی کتنی پر سکون جھپٹوں میں گناہ کے کنول کھلا چکا تھا۔ کتنی ہی معصوم کھلیاں پھول بننے کے بعد انتقام کے ڈھیر لے کر کانٹوں سے اس کے نفرت انگیز وجود کو ختم کرنے کی خواہش دل میں لیے موت کی آغوش میں جا سوئی تھیں۔

وہ اپنے کاروبار سے لاکھوں کماتا تھا۔ اکیلی جان تھی۔ اس کی رہائش ماڈرن کالونی کی کوٹھی نمبر ۲۰۰ میں تھی۔ اس کے گھر پر اکثر و بیشتر عیاشی کی محفلیں جیتی تھیں۔ شراب و شہاب بے حساب موجود ہوتے۔ وہ ان سے اپنا بھلا نہاتا۔ اس کے میاں نفرت دوست اس کے مال پر خوب کھجورے اڑاتے۔ وہ اپنی بچی جھوٹی

شامی مسکرا دی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

”ماں۔ میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔ دل بیضا جا رہا ہے۔“ شامی سینے پر ہاتھ رکھ کر بھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ کلب جا رہے تھے۔ شامی کی طبیعت صبح سے ہی بھاری بھاری تھی۔

”کیا محسوس ہوتا ہے؟“ شامی نے گھر مندی سے پوچھا۔

”ماں۔ جیسے کوئی میرے سارے جسم کی طاقت ختم کیے دے رہا ہو، طلق خشک ہوا جا رہا ہو۔ ماں جسم میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی سر کو صوفے کی پشت پر مارنے لگی۔

شامی کی آنکھوں میں بھی تشویش کے سائے لہرا لے گئے۔

”اب کیا کیا جائے؟“ شامی نے اس کے ہاتھ سے ہینڈ پوٹچھے ہوئے کہا۔

”ماں۔“ شامی نے آنکھیں کھول کر شامی کی طرف دیکھا اور شامی اس کی

سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر چونک پڑی۔

اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ شامی کی آنکھیں اپنی رعیت بدل رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک کونٹیں لے رہی تھیں۔ چرے کی رعیت بدل گئی تھی اور۔۔۔

”شام۔“ وہ تیزی سے سیدھی ہو کر بولی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ چونک پڑا۔

”یہ مینے کے آخری دن تو نہیں؟“

اور شامی بھی چونک پڑا۔ مینے کے آخری دن ہی تو تھے۔ ”ہاں۔“

”اوہ۔۔۔ سارا پروگرام خراب ہو گیا۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

لیکن پھر انہیں شامی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے حلق سے عجیب سی کراہ خارج ہوئی تھی۔ شامی نے شامی کو اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا اور دونوں پرے ہو کر انتظار کرنے لگے۔

وقت گزر رہا تھا۔۔۔ دیر دیر۔۔۔

تقریباً سن سن کر جیسیں خالی کرتا رہتا تھا۔۔۔ وہ ہوتا۔ اس کے مسکہ باز دوست ہوتے اور شراب و شباب۔۔۔

لوٹیاں خود بخود اس کی طرف کھینچیں اور بقیہ کسر وہ اپنی لہجے دار باتوں اور دولت کی جھلک دکھا کر پوری کر لیتا۔ رینا کلب میں ایک میز جیسے اس کے نام پر بک رہتی۔ کبھی ساری رات اور کبھی دو گھنٹہ کے لیے وہ کلب میں ضرور آتا تھا۔

شامی کو آصف سے بہت کام کی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ حالات نے آصف کو علم کی دولت، طاقت میں رکھ کر پٹ نپا بیک پر گزارہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شامی نے اس سے سوال کیا تو وہ مسکرا کر بولا۔ ”میڈم“ میں اس شپ سے اتنا کمایا ہوں جتنا ایک اعلیٰ افسر رشوت لینے کے بعد بھی نہیں کما سکتا۔ میں ہاتھ پھیلا کر نہیں مانگتا، لوگ اپنی خوشی سے دیتے ہیں۔ پھر یہ رشوت سے بہتر ہے۔ گناہ نہیں ہے۔“

”لیکن یہ بیک ہے۔“ شامی نے بحث کی۔

”رشوت لینے سے بہتر ہے کہ بیک لے لی جائے۔“ اس نے شامی کو لاجواب

کر دیا۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی۔۔۔ کہ کس طرح وہ اپنے منصوبے پر عمل کرے۔ وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔۔۔ پھر اس کی آنکھیں پٹک اٹھیں۔ اس نے کوئی ٹھوس لائحہ عمل ترتیب دے لیا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور شامی کی طرف دیکھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”شام۔“ اس نے آہستہ سے آگے کو جھک کر کہا۔

”ہوں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ شامی بیٹھے بیٹھے اونگھ مٹی تھی۔

شامی آہستہ آہستہ شامی کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ جوں جوں وہ کہتی گئی شامی کی آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو اس نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کی پر زور تاکید کی۔

”بس تو ٹھیک ہے۔ آج سے ہی اس پر عمل شروع ہو جانا چاہئے۔“ اس نے

کہا۔

نیل و دجت کے تو میرے ہر حکم کی قیل کرے گی۔ قیل کرے گی، قیل کرے گی۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں سے آنک کی پلٹیں نکل رہی تھیں اور شاکی ہولے سے پھکارا جیسے وہ اس کی بات سمجھ گئی ہو اور اقرار کر رہی ہو۔

شاکی کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اس کے تے ہوئے چہرے پر نرمی کے آثار پھیل گئے۔ آنکھیں بھی اصل حالت میں آگئیں۔ اس نے آہستہ سے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور ایک لمبے کے لیے شاکی کا جسم اس کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا۔

اب پھر وہ اپنی سرخ زبان نکال نکال کر پھکار رہی تھی۔ شاکی نے اسے اس کے بستر پر ڈال دیا۔ وہ پھنٹا پھنٹا لڑنے لگی۔

شامو جو بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، شاکی کی طرف بڑھا اور آہستہ سے اس کے پھن پر ایک ہلکی سی چپٹ لگائی۔ وہ اس کی طرف زور سے پھکار کر بڑھی اور شامو ہنستا ہوا شاکی کی طرف بڑھ گیا۔

انہوں نے کمرے کو باہر سے لاک کیا اور ہوش سے باہر آگئے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔

شاکی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شامو نے اس کی طرف دیکھا۔ ”نازو۔“ اس نے پیار سے پکارا۔ وہ چونک پڑی اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس کے شانے پر سر ٹکراتے ہوئے بولی۔

”مسلکی کے بغیر تو کچھ ہو نہیں سکتا۔“ اس نے شاکی کا فرضی نام دہرایا۔

”ایک بات کہوں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”کو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

شاکی ڈول رہی تھی۔ اچانک شامو کو کچھ خیال آیا۔ اس نے شاکی کے کان میں کچھ کہا اور وہ سر ہلاتی ہوئی ایک طرف بڑھ گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں شامو کی دی ہوئی مورتے کے عطر کی شیشی تھی۔ اس نے شیشی کھول کر تیز تیز اور لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی شاکی کے نتھنوں سے لگا دی۔ اس نے تین چار گھرے اور تیز سانس لیے اور شاکی نے شیشی ہٹا کر شامو کو دے دی۔

شاکی کی حالت میں نمایاں فرق آگیا۔ اس کے چہرے پر طہانیت کے آثار پھیل گئے اور وہ جیسے نشے میں ڈول رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی سرسراہٹ۔۔۔ پھکار خارج ہوئی۔

”شوگما۔۔۔“ اور یک لخت اس کے پاؤں سے سربک سانپ کی کینچلی کھنج گئی۔ اب وہ سر تاپا ناگن تھی۔۔۔ جو صوفے پر کنڈلی مارے بیٹھی ان کو کھور رہی تھی۔

اس کے ہونٹوں سے ایک اور پھکار خارج ہوئی۔ جیسے وہ ان سے کچھ کہہ رہی ہو۔ شاکی نے آگے بڑھ کر اسے پھن کے نیچے سے پکڑ لیا اور اس کا لہرا تا ہوا جسم شاکی کے بازو سے لپٹ گیا۔ وہ اپنی سرخ سرخ زبان نکال کر آہستہ آہستہ پھکارنے لگی۔ جیسے ان سے باتیں کر رہی ہو۔

شامو دلچسپی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاکی نے اس کی چمکدار آنکھوں میں غور سے دیکھا اور شاکی کی زبان آہستہ منہ کے اندر واپس چلی گئی۔ ان کی آنکھیں ایک دوسرے میں گڑی ہوئی تھیں۔ پھر شاکی نے آہستہ آہستہ پراسرار سی آواز میں کنا شروع کیا۔

”شاکی۔“ وہ ہولے سے پھکارا جیسے وہ اس کی باتیں سن رہی ہو، سمجھ رہی ہو اور جواب دے رہی ہو۔

”شاکی۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔ جب تک تو اپنی اصلی حالت میں نہیں آجاتی تو کمرے سے باہر نہیں جانے کی اور جب تو اپنی اصل حالت میں آجائے تو۔۔۔ تو میرے ہر حکم کی قیل کرے گی۔ کوئی سوال تیرے لب پر نہیں آئے گا۔ بغیر کسی

اور وہ تینوں کلب کے شاندار دروازے سے گزر کر اندر چلے گئے۔  
انہوں نے کل والے کیمین میں بیٹھ جملایا۔ شوکت ایک لڑکی کے ساتھ اپنی میز پر بیٹھا تھا۔  
”آصف! سنو۔ جب وہ جانے لگے تو۔۔۔“  
”آپ کو خبر کروں۔“ وہ مسکرا کر شامی کی بات کاٹ کر بولا اور وہ بھی مسکرا پڑی۔

”اور ہاں۔۔۔ کیا یہاں دودھ مل سکتا ہے؟“  
”کیوں نہیں۔ یہاں عیاشی کرنے والوں کو دودھ کی بھی ضرورت پڑتی ہے میڈم۔“ وہ طنز سے لہجے میں بولا۔  
”تو پھر دو گلاس لے آؤ۔“  
”بہتر۔“ وہ تھوڑی دیر بعد دو گلاس میز پر رکھ کر باہر نکل گیا۔  
وہ آہستہ آہستہ دودھ کے گلاس خالی کرتے گئی۔  
شامی دودھ پیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور شامو۔۔۔ وہ اس کے حسین چہرے کو نکتے میں مگن تھا۔

☆○☆

”میڈم۔ شوکت صاحب جا رہے ہیں۔“ آصف نے تیزی سے اندر داخل ہو کر کہا اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”او کے آصف۔“ شامو نے آصف سے ہاتھ ملایا اور دونوں نے باہر نکل کر دیکھا، شوکت کھڑے کھڑے شراب کا جام حلق میں اخیل رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے کیمین سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔  
شوکت نے جام خالی کر کے میز پر رکھا۔ جیب سے روپال نکال کر ہونٹ صاف کرتا ہوا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ بل ادا کر کے وہ لڑکھاتے ہوئے قدموں سے

”جب تک سلتی ٹھیک نہیں ہو جاتی تم اپنا کام کیوں نہیں شروع کر دیتیں۔“  
”ہوں۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔  
”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ دپے دپے جوش سے بولی۔  
”تو پھر آج ہی؟“ شامو نے پوچھا۔  
”ہاں۔ آج ہی ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔  
”لیکن احتیاط ہے۔“ وہ چار سے بولا۔  
”تم فکر مت کرو۔“  
تھوڑی دیر بعد ٹیلی کلب کے پورچ میں رک گئی۔ وہ اترے۔ شامو نے کرایہ ادا کیا اور وہ کلب کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔  
”ٹھہرو شام۔ ایسا کرو کہ آصف کو باہر بلاؤ۔ میں اس سے ایک بات پوچھتا چاہتی ہوں۔“  
”ٹھیک ہے۔“ وہ کوئی استفسار کیے بغیر اندر چلا گیا۔  
شامی کپاؤنڈ میں کھڑی کاروں پر نظر دوڑانے لگی۔ لمبی لمبی چمکدار، سرخ، سبز، سفید، سیاہ رنگ کی کاریں۔۔۔  
”فرمائیے میڈم۔“ آصف کی آواز سن کر وہ پلٹ پڑی۔  
”اوہ آصف۔ آؤ۔“ وہ چند قدم پرے چلی گئی۔ شامو اور آصف اس کے نزدیک ہو گئے۔

”کتنے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔  
”شوکت کی کار کون سی ہے؟“ وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔  
”شوکت صاحب کی کار۔۔۔“ وہ کپاؤنڈ میں کھڑی کاروں پر نظر دوڑانے لگا۔  
”وہ دیکھئے۔۔۔ وہ سیاہ رنگ کی شیور لیٹ۔“ اس نے آخری سرے پر کھڑی ایک سیاہ رنگ کی لمبی چمکدار کار کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی نشانی یہ ہے کہ شوکت صاحب نے اس کی ہیڈ لائٹس پر سفید پلاسٹک کوڑچھا رکھا ہے۔“ وہ بولا۔  
شامی نے فور سے کار کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ”آؤ چلیں۔“ وہ ہٹیں

لاک کھولا اور اندر داخل ہو کر سوچ ڈھونڈنے لگا اور وہ سانپ --- آہستہ سے کمرے کے اندر رینگ گیا۔

شوکت نے ہن دیا اور کمرہ جھانکا اٹھا۔ وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کپڑے بدلے اور ایک دوسری الماری کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے اس الماری کے پٹ کھولے۔ اندر بزمین شراب کی بوتلیں جتی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بوتل اگلاس اٹھایا اور میز پر دو دنوں چھریں رکھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ صوفے پر آ بیٹھا اور بوتل کا کارک اڑا کر شراب گلاس میں اترنے لگا۔

وہ شراب کا گلاس ہونٹوں تک لے گیا لیکن اچانک اس کے ہاتھوں سے گلاس پھوٹ کر فرش پر آ رہا۔ چمکے کی آواز کے ساتھ گلاس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ شراب فرش پر پھیل گئی لیکن وہ تو ایک تک سامنے والے صوفے کی طرف دیکھے جا رہا تھا جہاں --- جہاں --- ایک سانپ کٹلی مارے بیٹھا اسے اپنی چنگار آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

شوکت کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں اور اس کے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ پھر وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کی نظریں جیسے چرائیں۔ سانپ اسے اپنی آنکھوں کی مقناطیسی کشش سے قابو میں کر چکا تھا۔ شوکت کا ہاتھ دہرہ ہونٹوں کے قریب ساکت تھا۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے جان بیٹھا تھا۔

پھر --- سانپ کے پھن کو حرکت ہوئی۔ شوکت ایک چیخ مارا کہ اس کے ساتھ صوفے پر اٹھ گیا۔ اب سانپ کے پھن میں مسلسل حرکت تھی۔ وہ اپنا پھن لہرا رہا تھا۔ شوکت بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس سینے پر کسی نے دھڑی پھر رکھ دیا ہو۔

اور --- آنکھیں کھلنے ہی اس کے ہونٹوں سے ایک خوفزدہ چیخ آزاد ہو گئی۔ اس نے ہاتھ مار کر سینے پر کٹلی مار کر بیٹھے ہوئے سانپ کو ایک طرف گرا دیا اور

دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی ہر ایڑی اس وقت ایک دوسری میز پر کسی اور کے ساتھ بیٹھی شراب سے شوق فرما رہی تھی۔ شوکت لڑکھاتا ہوا باہر نکلا۔ دربان نے جلدی سے سلام دے مارا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بغیر دیکھے ایک بڑا نوٹ دربان کی جیب میں ٹھونسا ہوا باہر نکل گیا۔ دربان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جیب سے نوٹ نکال کر اندر کی جیب میں رکھا اور پھر مستعد ہو گیا۔

شوکت گرتا پڑتا اپنی کار تک پہنچا۔ اس نے جیب سے چایاں نکالیں اور دروازے کا لاک کھولنے لگا لیکن یہ کیا؟ لاک تو پھلے ہی کھلا ہوا تھا۔

”اوہ۔ آج میں گاڑی لاک کرنا ہی بھول گیا۔“ اس نے نٹے میں لڑکھاتی ہوئی زبان سے کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ چابی لٹکی اور اشارہ کر دیا۔ کار بلی کی گونج کے ساتھ جاگ اٹھی۔ ایک جھٹکا لگا اور کار آگے بڑھی۔ اس نے بیڑ لائٹس آن کر دیں اور اندر مرسے میں ڈوبے کپاؤنڈ میں روشنی پھیل گئی۔ اس نے ایک بار آنکھوں کو ملا اور پھر کار ”ڈون“ کی آواز کے ساتھ کلب کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

کار سڑک پر تیزی سے بھٹکتے گئی لیکن اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک عیسیٰ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سڑک سنان پڑی تھی۔ اس نے کار کے شیشے چڑھا دیے۔

سرد ہوا خون محمد کر رہی تھی۔ کار اپنا فاصلہ طے کرتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے کار رک گئی۔ اس نے ہارن دیا اور سوتا ہوا چوکیدار جاگ اٹھا۔ اس نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ شوکت اپنی کار اندر لے گیا۔ دروازہ کھول کر پیچے اتر پڑا۔ اس نے کار کا دروازہ بند کیا اور نٹے میں جھومتا ہوا اپنی شاندار کونجی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا لیکن یہ وہ نہ دیکھ سکا کہ اس کے ساتھ ہی کار سے ایک سانپ بھی رینگتا ہوا باہر آتا جو اب اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے چلتے فرش پر پھسلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

شوکت نے اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر جیب سے چایاں نکالیں۔





تاریک پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے پشت کے بل پیچے کو کھٹکنے لگا مگر کسی سے ٹکرا کر رک گیا۔

اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ نقاب پوش اسے اپنی سرخ، چمکدار آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہ بجائے کب اس کے پیچھے آگڑا ہوا تھا۔ پھر --- سانپ کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ شوکت کا سانس کھٹنے لگا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سانپ کو دیکھا جو اب اپنی سرخ سرخ زبان کو باہر نکال کر پھینک رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر نقاب پوش کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں بھبک گئیں لیکن نقاب پوش پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے زہریلی نظروں سے گھورتا رہا۔ شوکت کا سانس اُدھر کا اُدھر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ سانپ اس کی ٹانگوں پر رینگ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ --- رینگتا ہوا وہ اس کی چھاتی پر آگیا اور کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ شوکت کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ سانپ اس کی چھاتی پر کنڈلی مارے بیٹھا پھینک رہا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا، اس سارا جسم پیٹے میں بھبک گیا۔ چرے پر پیٹے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پھر سانپ ایک بار پھینک کر اس کی چھاتی پر ڈسنے والے انداز میں لپکا۔

وہ جھج پڑا --- لیکن سانپ نے اسے ڈسا نہیں تھا۔ وہ تو عین اس کے سینے تک اپنی زبان لاکر پھر سیدھا ہو گیا تھا اور اب پھر پھینک رہا تھا۔

شوکت نے ایک بار پوری قوت جمع کر کے اپنی آنکھیں کھولیں --- پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

نقاب پوش نے ایک طویل سانس لے کر اس کے سر کے نیچے سے اپنے پاؤں ہٹا لیے اور شوکت کا سر فرش پر ٹک گیا۔ اس نے آہستہ سے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔ نقاب کے نیچے سے ایک حسین اور جوان چہرہ نمودار ہوا۔

شامو کا چہرہ --- وہ مسکرا کر سانپ --- نہیں --- ناگن --- نہیں --- شامی

سے سیاہ ریشمی رومال میں چھپا ہوا تھا۔

نقاب پوش کے ہاتھ کو حرکت ہوئی اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چاقو دبا ہوا تھا۔ اس نے دو سرا ہاتھ بھی باہر نکالا اور کڑکڑاہٹ کی آواز سے سارے کمرے کی فضا درہم برہم ہو گئی۔ چاقو کا چمکدار پھل اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا۔ وہ چونک پڑا۔

”کون ہو تم؟“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

”میں ---“ وہ پراسرار لہجے میں بولا اور اس کا قہقہہ --- زور دار قہقہہ گونج اٹھا شوکت کا خون رگوں میں کھٹنے لگا۔ ایسا ہی خوفناک تاثر تھا اس کے قہقہے میں۔

پھر نقاب پوش نے آہستہ سے قدم آگے بڑھائے۔ شوکت کے جسم میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ خوفزدہ انداز میں گڑگڑایا۔ ”نہیں نہیں ---“ سر ہلاتا ہوا وہ پیچھے ہٹنے لگا پھر وہ صوفے کی پشت سے ٹکرا کر دوسری طرف الٹ گیا۔

وہ جلدی سے سیدھا ہوا اور اس کے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اپنے پاس کنڈلی مارے بیٹھے ہوئے سانپ کو دیکھ کر پرے کھٹکنے لگا۔

نقاب پوش چونکدار کے پاس آ کر رک گیا۔ اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ اٹھایا اور شست ہاندھ لی --- ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بجلی سی چمکی اور چاقو شوکت کے سر کے پاس اس کے اور سانپ کے درمیان صوفے کے بازو میں گھس گیا۔

چونکدار اسی طرح سانپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پتھر کے بت کی طرح کھڑا تھا اور پھر --- سانپ کے چمن کو ذرا سی حرکت ہوئی --- وہ پھینکدار اور چونکدار الٹ کر فرش پر گر پڑا۔ ایک کراہ اس کے منہ سے خارج ہوئی اور وہ پھرتا رہی ہوئی آنکھوں سے ایک بار تڑپ کر سناٹ ہو گیا۔ اس کے ناگ اور منہ سے خون کی دھار پھوٹ نکلی تھی۔

اب سانپ نے اپنا رخ شوکت کی طرف کر لیا۔ شوکت کا تاریک چہرہ کچھ اور

کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ سے رینگ کر شوکت کے سینے سے اتر گئی اور فرش پر آکر وہ آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دم کے بل فرش پر کھڑی تھی۔ بالکل سیدھی۔

شامو نے چاقو اور کوٹ کی جیب میں ڈالا اور ادھر سے ناگن زور سے پھکاری۔ ”شوگاما۔“

سرخ زبان منہ کے اندر چلی گئی۔

دوسرے ہی لمحے اس کی کینٹلی سر سے پاؤں تک غائب ہو گئی اور اب وہاں شامی کھڑی تھی۔

شامو اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جا کر رک گیا۔

انہوں نے ایک حقارت بھری نظر شوکت کے بے ہوش جسم پر ڈالی۔

”میں تجھے سکا سکا کاروں کی۔۔۔ مار مار کر زندہ رکھوں گی۔ باجو۔“ وہ ہونٹ بھیج کر بولی اور نفرت بھری نظریں پھیر لیں۔

”آؤ شام، چلیں۔“

شامو نے شامی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور دونوں قدم بہ قدم۔۔۔ شانہ بٹانہ دروازے سے باہر نکل گئے۔ چوکیدار کی روح کب کی گھس غصری سے پرواز کر چکی تھی اور شوکت۔۔۔ دنیا و مائینا سے بے خبر بے ہوش پڑا تھا۔

☆○☆

اگلے دن کے اخبار میں آصف ایک خبر پڑھ کر چونک پڑا۔

خبر شوکت کے متعلق تھی۔ ساری خبر پڑھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

شوکت کے بیان کے مطابق ایک سانپ نے اسے ساری رات دہشت زدہ کئے رکھا اور ایک نقاب پوش کا بھی اس خبر میں ذکر تھا۔ شوکت کا بیان تھا کہ اس نے نقاب پوش کو نہیں دیکھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ سانپ وہی لے کر آیا تھا۔ اس

کے چوکیدار کو سانپ نے اپنی نظروں کے وار سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بات ماننے میں نہ آتی تھی لیکن شوکت ایک ذی ہوش انسان تھا۔ پھر وہ ایک بہت بڑا صنعت کار تھا۔ بہت بڑی حیثیت کا مالک تھا۔ پولیس کو اس کے بیان پر یقین کرنا ہی پڑا اور اب اس کی کوٹھی پر پولیس کا پہرہ تھا۔

آصف بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ نگ آکر اس نے شامو اور شامی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اخبار ایک طرف ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے بدلے اور تیار ہو کر باہر نکلے گا۔

”کمال جا رہے ہو بیٹا؟“ اس کے بوڑھے باپ نے پوچھا۔

وہ ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ اسے کینسر تھا اور اس بیماری نے اسے چارپائی کا دوست بنا دیا تھا۔ آصف باپ کی بہت خدمت کرتا تھا۔

پانچ کمرؤں پر مشتمل مکان تھا۔ خوبصورت اور فحاشت سے سجا ہوا لیکن اس میں ان کے معرف میں دو کمرے ہی رہتے تھے۔ ایک اس کے باپ کے لیے اور دوسرا اس کے اپنے استعمال میں تھا۔ باقی کمرے ہر قسم کے سامان سے آراستہ لاک رہتے تھے۔

”ایک دوست نے لے جا رہا ہوں اباجان۔“ وہ رک گیا۔

”اچھا۔ جلد لوٹ آنا۔“ وہ کھانسا ہوا بولا۔

”جی اباجان۔“ وہ باہر نکل گیا۔ اس نے ایک ٹیکسی لی اور شیبا ہوش کی طرف

روانہ ہو گیا۔ سارے راستے وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔

☆○☆

”لیکن یہ سب۔۔۔“

”تیرت کی کوئی بات نہیں آصف صاحب۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

اور آصف خاموش ہو گیا۔ شامی اور شامو نے اقرار کر لیا تھا کہ یہ کام ان ہی

”جیسے آپ کی مرضی۔“ شامو کندھے اچکا کر بولا اور آصف کے چہرے پر رونق دوڑ گئی۔

”تو پھر کب چلے گا؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”سہلی آجائے تو چلیں گے۔“ شامی نے کہا۔

”بہتر۔“ وہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گیا۔

شامی نے خٹلے نے ناز و رازہ کھولا اور پانی کے ٹب میں لیٹی ہوئی شامی کو اٹھایا کر بستر پر لا ڈالا۔ شامی بستر پر لوٹنے لگی۔ وہ اس سے کیلئے لگی۔ بچوں کی طرح۔۔۔



سارے کلب میں شوکت کے واقعے کا چرچا تھا۔ لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے لیکن کوئی بھی اصل بات کی तर تک پہنچنے پر قادر نہ تھا۔ شوکت آج ابھی تک کلب نہیں آیا تھا۔ شامی اور شامو اپنے مخصوص کیمپ میں موجود تھے۔ آصف ان کو دودھ کے گلاس دے کر چاچا تھا وہ اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہے تھے۔ رات کا ایک بج گیا لیکن شوکت نہ آیا۔ آصف کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ شامو، شامی اور آصف اکٹھے باہر نکلے۔

”شوکت تو آج آیا نہیں۔ اب کیا کیا جائے؟“ شامی نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس کی کوٹھی پر پولیس کا پہرہ ہے۔“ آصف نے بتایا۔

”تو پھر؟“ شامی نے سوچتے ہوئے کہا۔

وہ سب سوچنے لگے۔ وہ پیدل ہی فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔

”شوکت کا کوئی ملازم نہیں ہے؟“ شامی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتا۔“ آصف بولا۔

”ہوں۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

کا ہے لیکن وہ یہ بتانے پر تیار نہ ہوئے کہ یہ سب انہوں نے کیسے کیا؟ سانپ کہاں سے حاصل کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

تب اسے پہلی بار شامی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ادھر ادھر نظرس دوڑائے لگا۔ شامی نے اس کی بے تاب نظروں کا معلوم سمجھ لیا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ آصف صاحب؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

”جی، وہ۔۔۔ سہلی صاحبہ نظرس آ رہیں۔“ اس نے شامی کی طرف دیکھا اور گہرا کر نظرس جھکا لیں۔ بجائے کیوں اسے شامی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سی دہشت کا احساس ہوتا تھا۔

”سہلی۔۔۔ وہ چند دن تک لوٹ آئے گی۔ ایک کام سے گاؤں گئی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور آصف اداس سا ہو گیا۔

”اچھا۔ اب مجھے اجازت دیجئے، اگر کوئی کام ہو تو بتائیے۔“ وہ اٹھنے کے انداز میں بولا۔

”آصف صاحب۔ یہاں رہ کر ہم کل کر کام نہیں کر سکتے، اگر کوئی جگہ کچھ عرصے کے لیے کرائے وغیرہ پر مل جائے تو۔۔۔“

”کرائے کی جگہ کی کیا ضرورت ہے؟ میرا گھر حاضر ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”آپ کا گھر؟“ شامو سوالیہ انداز میں بولا۔

”جی ہاں۔ پانچ کمرے ہیں، تین خالی پڑے رہتے ہیں۔ صرف دو کمرے میرے اور اہاجان کے استعمال میں ہیں۔“

”لیکن۔۔۔“

”جی نہیں۔ اگر آپ مجھے اپنا ساتھی سمجھتے ہیں تو پھر یہ اجنبیت کیسی؟“

”میرا مطلب ہے آپ کے اہاجان کو تکلیف ہوگی۔“

”جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ بھی سارا دن گھر میں اکیلے پڑے پڑے اکتا جاتے ہیں۔ تیار آدمی ہیں، ان کا بھی دل لگ جائے گا۔ ان کی خاطر ہی چلے چلے۔“

اور وہ تیار ہو گئے۔

”میرے خیال میں شوکت کی کوٹھی کی طرف چلتے ہیں۔ ذرا حالات کا جائزہ لیں گے۔“ آصف نے تجویز پیش کی اور وہ راستہ بدل گئے۔

پیدل چلتے ہوئے وہ شوکت کی کوٹھی کے پاس پہنچ گئے لیکن وہ کوٹھی کے بالکل نزدیک نہ گئے۔ ایک دوسری کوٹھی کی آڑ میں کھڑے دیکھتے رہے۔ کوٹھی کے گیٹ پر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ شاتی نے کچھ دیر سوچ کر شامو اور آصف کے کان میں کچھ کہا اور کچھ دیر کی بحث کے بعد وہ ایک پلان بنا چکے تھے۔

آصف اور شامو دبے قدموں کوٹھی کی طرف بڑھنے لگے۔ شاتی ایک طرف اندھیرے میں رینگ گئی۔

وہ دونوں سر جھکائے کوٹھی کے گیٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔ دونوں سپاہی ان کو غور سے دیکھنے لگے۔ آصف آہستہ سے کھٹکارا اور دوسرے ہی لمحے دونوں سپاہیوں کی گردنیں ان کے بازوؤں کے ٹکڑے میں دبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ساکت ہو گئے۔

”جان سے تو نہیں مار دیا۔“ شامو نے جبک کر ان کا معائنہ کیا۔ پھر اطمینان کی سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ صرف بے ہوش تھے۔

ان کو اسی طرح دیوار کے سارے کھڑاکر کے وہ گیٹ سے اندر کود گئے لیکن ان کو ویک جانا پڑا۔ اچانک ہی شامو کی نظر اندر دروازے پر کھڑے ہوئے دو سپاہیوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ سرگت کے کش لگا رہے تھے۔ وہ آہستہ سے ایک طرف رینگ گئے اور پھر جھکے لیکن ان کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے قریب پہنچ کر وہ آہستہ سے سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر اچانک ہی وہ ان پر بھج پڑے۔ سپاہی ان کی مضبوط گرفت میں پھنس گئے لیکن انہوں نے ان کو کم از کم تین گھنٹوں کے لیے آرام سے سلا دیا اور ہاتھ بھاڑتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو گئے۔

”آصف۔ تم یہاں دھیان رکھو۔ میں اندر جانا ہوں۔“ شامو نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ سر ہلا کر بولا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ شامو نے کن اکھیوں

سے اپنے اور کوٹ کی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھا جس میں کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

تمام بلب روشن تھے اور ہر کمرے کا دروازہ بڑی مضبوطی سے بند تھا۔ وہ ہولے ہولے چتا ہوا شوکت کے کمرے کے دروازے پر رک گیا اور جبک کر قفل کے سوراخ سے اندر دیکھنے لگا۔ شوکت بستر پر بیٹھا بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھول دبا ہوا تھا۔

شامو نے اوپر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ دروازے کے عین اوپر روشن دھن تھا اور کھلا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھیل گئی۔ اس نے اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ناگن دلی ہوئی تھی۔

وہ اس ہاتھ کو زمین تک لے گیا اور اسے جھوڑ دیا۔ وہ چھن اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور شامو نے ہاتھ سے اوپر روشن دان کی طرف اشارہ کر دیا۔ ناگن نے اپنا چھن اٹھا کر اوپر دیکھا اور آہستہ سے پھٹکاری۔ دوسرے ہی لمحے وہ دیوار پر چڑھنے لگی۔ اس کی رفتار کافی تیز تھی۔

”احتیاط سے شاتی“ وہ سسل ہے۔“ شامو سرگوشی کے انداز میں بولا اور ناگن ایک لمحے کے لیے ٹھک کر پھر اوپر چڑھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ روشن دان سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ شامو نے جلدی سے آنکھ قفل کے سوراخ سے لگا دی۔

شوکت بستر پر لیٹ گیا تھا اور سامنے دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ چونک پڑا۔ شوکت تیزی سے سیدھا حوا پر بستر سے اتر آیا تھا۔ اس کا ہتھول والا ہاتھ حرکت میں آیا لیکن --- اچانک وہ ساکت ہو گیا۔ اس کا ہتھول والا ہاتھ اٹھای رہ گیا۔

شامو نے نظریں گھما کر دیکھنے کی بت کو شش کی لیکن اسے مزید کچھ نہ دکھائی دیا۔ قفل کے سوراخ سے صرف سامنے کا منظر ہی دکھائی دیتا تھا۔ --- پھر ---

شوکت نے ہتھول ایک طرف پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور دروازے کی طرف بھاگ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلنے لگا لیکن اس کے حلق سے جھج نکلتے نکلتے رہ گئی۔ دروازے پر دی ٹھاب پوش کھڑا تھا۔

وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ آصف پہلے کود گیا۔ شامو نے جلدی سے جب سے ناگن کو نکال کر زمین پر چھوڑ دیا اور وہ تیزی سے ایک دیوار کی طرف رینگ گئی۔ شامو بھی باہر کود گیا اور وہ تیز تیز قدموں سے پلٹے ہوئے آگے بڑھے۔ سپاہی اسی طرح بے ہوش پڑے تھے۔

”کیوں کیا رہا؟“ شامی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی۔

”ٹھیک۔ بالکل صحیح۔“ شامو نے مسکرا کر کہا۔ اور اس نے دکھاوے کی ایک طویل سانس لی۔ آصف کو اس راز کا پتہ نہ چل سکا کہ شامی ہی وہ سانپ ہے جو شوکت کو خوفزدہ کرتا ہے۔

وہ تیز تیز قدموں سے اپنے راستے پر ہوئے۔ آصف خوش تھا کہ اس نے سانپ کو شامو کی جیب میں محسوس کر لیا تھا۔

آصف اپنے کمرے کے راستے پر ہو لیا اور وہ آصف سے ہاتھ ملا کر دیے لیوں مسکراتے ہوئے ہوش کی طرف چل پڑے۔ شامو جانتا تھا کہ آصف نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ اس نے شامی کو بھی بتایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

”کوئی بات نہیں شامو۔“ وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دور اندھیرے میں گم ہو گئے۔

☆○☆

”شوکت کو خمی چھوڑ کر ہوش میں منتقل ہو گیا ہے۔“

یہ خبر سن کر شامی کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسا ہی کوئی قدم اٹھائے گا۔ اب اس کی کو خمی منتقل پڑی ہے۔

”وہ کون سے ہوش میں ہے؟“ شامی نے پوچھا۔

”نئی ہوش۔۔۔ عیاشی کا شاندار اڑاؤ۔“ آصف نے کہا۔

”ہوں۔“ شامی کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ اس نے کچھ سوچے ہوئے سر ہلایا۔

وہ گھبرا گیا۔ اس کا سانس دھونکی کی طرف چل رہا تھا۔ چہرے میں بیگم ہوا تھا اور آنکھوں سے خوفزدگی کے آثار جمائے گئے تھے۔

شامو نے اپنا قدم آگے بڑھایا اور شوکت اٹنے پاؤں پیچھے ہٹے۔ شامو نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ شوکت نے خوفزدہ نظروں سے دیوار پر دیکھا۔ سانپ غائب ہو چکا تھا۔ وہ سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اچانک اس پر کوئی چیز آن گئی۔ وہ جھج پڑا۔ سانپ اس کی گردن میں حائل تھا۔ اس نے شوکت کی گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا اور سرخ سرخ زبان نکال کر پھنکارنا ہوا بار بار اس کے چہرے کی طرف پھن بڑھانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے گردن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سانپ کی گرفت اور بھی زور پکڑتی گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں میں اندیرا چھا گیا۔ سانپ منہ بند کر اس کے چہرے پر اپنا منہ بھیرنے لگا۔۔۔ وہ آنکھیں بند کر کے چیخنے لگا اور ہر۔۔۔ وہشت سے فٹھ لکھایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر آ رہا۔

ناگن نے چند لمحوں بعد اس کی گردن کو چھوڑ دیا اور رینگ کر فرش پر آ گئی۔ اب وہ کنڈلی مارے اس کے سرے سے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے قریب بیٹھی جمو جتی رہی۔ شامو نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور وہ اوور کوٹ کی جیب میں لٹائی۔

شامو نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور گیٹ پوشنے لگا۔ باہر نکل کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف سے آصف اس کی طرف بڑھا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”کوئی نہیں۔“ آصف بولا۔

وہ شامو کی پھولی ہوئی جیب کو شوکت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس میں موجود شے کی حرکت کو وہ اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ شوکت خوفزدہ کیوں ہوتا تھا۔ سانپ اس سے لپکتا ہی ایسے تھا اور ایسی کرتیں کرتا تھا کہ اسے ہارت اٹیک بھی ہو سکتا تھا۔ سانپ اسے ڈستا نہیں تھا۔

براجان تھی۔

کارشی ہوٹل کے کپتانڈ میں رکی لیکن ان کے اترنے سے پہلے ہی پھیلی کڑی سے کوئی شے ریک کر باہر نکل گئی۔

وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت ہوٹل کے باہر ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس میں سے ایک نوجوان اترتا۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور اوور کوٹ ہاتھ پر ڈالے اندر چلا گیا۔

دروازے سے اندر داخل ہو کر وہ ایک لمبے کے لیے راک شوکت اور انجم میز میاں چڑھ رہے تھے۔ ہوٹل کا ہال خالی ہو چکا تھا اور سب لوگ دوسرے کمروں میں مختلف کھیلوں میں مصروف تھے۔ وہ تیزی سے میز میاں کی طرف بڑھا۔

شوکت انجم کو لیے ایک کمرے کے دروازے پر راک اور تالا کھولنے لگا۔ اجنبی نے اوور کوٹ زیب تن کیا۔ اس کی جب سے فیلٹ ہیٹ نکال کر سر پر بٹائی اور شوکت اور انجم کے پیچھے رہتی ہوئی شے پر اس کی نظریں جم گئیں۔ ان کے ساتھ ہی وہ لمبی سی چیز بھی کمرے میں داخل ہو گئی اور فوراً ہی شوکت نے دروازہ بند کر لیا۔

چند لمبے کمرے تھے کہ شوکت چلتا ہوا باہر کو بھاگا۔ وہ دروازہ کھول کر گرنا پڑتا میز میاں تک پہنچا لیکن توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میز میاں سے لڑھک گیا۔ اس کی جھپٹیں سن کر تمام کمروں سے لوگ باہر نکل آئے اور اس کے بے ہوش جسم کے گرد جمع ہو گئے۔

اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ وہ کافی زخمی تھا۔ اجنبی اس کی طرف سے لا پرواہ تیزی سے شوکت کے کھلے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ فرش پر انجم کی لاش پڑی تھی اور اس کے قریب ناگن بھی اٹھائے کھڑی مارے بیٹھی تھی۔

ناگن نے اس کی طرف بھن پھیر کر دیکھا لیکن اجنبی --- جو شامو کے علاوہ کوئی نہ تھا --- انجم کی رنگ بدلتی لاش کو گھورے جا رہا تھا۔ لاش کا رنگ بالکل سیاہ پڑ

آصف کچھ دیر بعد آئے تاکہ کر باہر نکل گیا۔ وہ کلب کے مخصوص کیمین میں بیٹھے تھے شامی شامو سے آہستہ آہستہ کچھ کھنے لگی۔ شامو نے کچھ بٹ کی۔ پھر وہ ایک پروگرام پر متفق ہو گئے۔ وہ مطمئن تھے۔ تھوڑی دیر بعد آصف اندر داخل ہوا۔

”میڈم --- شوکت۔“ وہ جلدی سے ریشمی پردہ ایک طرف سرکا کر اس کی مخصوص میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شامی اور شامو آگے جھک گئے۔ شوکت اپنی میز پر بیٹھا خراب سے شغل کر رہا تھا۔ ابھی تک وہ اکیلا تھا لیکن وہ جو خسی سیدھے ہوئے گئے ’ان کو رک جانا پڑا۔ شوکت کی میز پر ایک خوبصورت لڑکی آ بیٹھی تھی۔

”یہ کون ہے؟“

”انجم۔“ شمر کے ایک بڑے سیٹھ کی عیاش بیٹی۔ ”آصف نے نفرت سے کہا۔ شوکت اور انجم سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے ٹیگ پر ٹیگ خالی کرنے شروع کر دیے۔

شامی اور شامو ان کے اٹھنے کا انتظار کرتے رہے۔ آصف اپنی ڈیوٹی ختم کر کے ان سے رخصت ہو چکا تھا۔

آخر --- فٹے میں بیٹھے ہوئے وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ شوکت نے انجم کی کمر میں بازو حاصل کر کے اسے اپنے ساتھ چننا لیا تھا۔ کاؤنٹر پر رک کر اس نے ٹل ادا کیا اور لا کھڑاتے ہوئے باہر نکلتے چلے گئے لیکن --- شامی اور شامو ان سے پہلے ہی باہر جا چکے تھے۔

شوکت انجم کو ساتھ لے لے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تازیبا حرکات کرتے ہوئے کار میں سوار ہو گئے۔ انجم ’شوکت کے ساتھ چلتی ہوئی تھی۔ شوکت نے کار اشارت کی اور کار سڑک پر تیزی سے بھستے لگی۔

مگر --- وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ ان کی بد قسمتی اس وقت بھی پھیلی سیٹ پر

چکا تھا جیسے وہ جل گئی ہو اور پورے جسم پر بڑے بڑے آبلے ابھر آئے تھے جن سے سیاہ رنگ کا مواد برہم رہا تھا۔ ان میں ہلکی ہلکی چیپ کی زردی نمایاں تھی۔ ناگن ہولے سے پھٹکاری اور شامو چونک پڑا۔

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کا ہاتھ اور کوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا۔ میزبجوں سے لوگوں کے اوپر چڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شور مچتا جا رہا تھا۔

وہ جلدی سے ایک بڑے سے ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اس نے اور کوٹ اتارا اور بیٹھ بھی سر سے اتار لیا۔ کوٹ کو تھم کر کے بازو پر ڈال لیا۔ اور کوٹ کی جیب میں ناگن سرسرا رہی تھی۔

لوگ شوکت کے کمرے کی طرف بڑھے اور اندر داخل ہو گئے لیکن پھر جیچیں مارنے ہوئے باہر کو بھاگے۔ تب شامو بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ جھوم کمرے سے کافی دور کھڑا تھا۔ پھر کسی نے پولیس کو فون کرنے کو کہا اور کئی آدمی نیچے کو بھاگے۔ ان ہی میں شامو بھی تھا۔

ایک آدمی پولیس کو فون کرنے لگا اور شامو ادھر ادھر دیکھتا ہوا باہر نکل آیا۔ شوکت کو ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اسے کافی چٹنیں آئی تھیں۔

باہر نکل کر اس نے پیدل ہی ایک طرف بڑھنا شروع کیا۔ ان کی رفتار کافی تیز تھی۔ اس نے ایک جگہ اندھیرے میں کمرے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس نے اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ناگن اس کے ہاتھ میں لہرائے لگی۔ اس نے اسے آہستہ سے زمین پر ڈال اور چند لمبے بعد وہاں شامی کھڑی تھی۔

شامو نے اور کوٹ پہن لیا۔ وہ دونوں چل پڑے۔

”تم نے انجم کو کیوں ختم کر دیا۔“ تھوڑی دیر بعد شامو نے پوچھا۔

”وہ۔۔۔“ شامی نے نفرت سے ہونٹ سکڑ لیے۔ ”وہ بزدل مجھے دیکھ کر جیچیں مارنے لگی تھی۔ مجھ کو ن ہی پارا سachi۔ عیاشی کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔۔۔“

ہوس پوری کرنے کے لیے آئی تھی۔“ اس کی آواز میں نفرت ہی نفرت تھی۔ شامو خاموش ہو گیا۔ باقی راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔

وہ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ میزبیاں طے کر کے شامی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ شامو بھی اس سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا لیکن اچانک وہ چونک کر رک گیا۔ شامی کے کمرے کے دروازے میں شامی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”بچا۔“ وہ بڑے پیار سے بولی اور وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ اندر داخل ہو کر وہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”تو کس وقت ہوش میں آئی؟“ شامو نے اس کے سر پر چپٹ لگائے ہوئے پیار سے پوچھا۔

”تمہارے جانے کے کچھ ہی دیر بعد۔“ وہ پیار سے اس کے شانے پر ٹھوڑی رکھ کر بولی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔



”اب وہ کہاں ہے؟“ شامی نے پوچھا۔

”ابھی تک ہسپتال میں ہے۔ اسے ایک خصوصی کمرے میں رکھا گیا ہے اور ہر طرف پولیس کا پہرہ ہے۔“ آصف نے اخبار سے پڑھی ہوئی تفصیل دہرا دی۔

”اس کا مطلب ہے، ہمیں کچھ دن کے لیے خاموشی اختیار کرنی پڑے گی۔“

”ظاہر ہے۔“ آصف نے کہا۔

وہ سوچ میں ڈوب گئے اور آصف نے آہستہ سے نظر اٹھا کر شامی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی نظریں۔۔۔ پیار بھری نظریں

”نہیں تو کیا ہوا؟“ وہ حیرت سے بولا۔  
 ”ہوں۔۔۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر مسکراتی ہوئی صوفے پر پھیل گئی۔  
 ”شام۔ آصف اور شاگی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”خیال۔ کیا خیال؟“

”ان کی شادی نہ کر دی جائے۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”کیا؟“ شامو حیرت سے بولا۔

”ہاں۔ کیا حرج ہے؟“

”لیکن۔۔۔ تمہارے نزدیک کیا یہ معمولی بات ہے!“ شامو کے لہجے میں حیرت اور غصہ دونوں شامل تھے۔

”تمہیں پہلے بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور اب تم بھر دہی غلطی کرنے جا رہی ہو۔“

”نہیں شام۔ اس بار میں غلطی نہیں کر رہی۔ میں نے آصف کا ذہن پڑھا ہے۔ اس کے دل کی بات معلوم کر لی ہے۔“  
 ”وہ کیا؟“ وہ آگے کو جبک آیا۔

”اس کے ذہن میں شاگی کو اپنانے کی زبردست تمنا ہے۔ وہ اسے پوجنے کی حد تک دل میں دل میں پیار کرتا ہے۔ شاگی اس کی زندگی میں داخل ہونے والی پہلی اور آخری لڑکی ہے۔ اور جانتے ہو جب اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اس کے ذہن میں کیا خیال آیا تھا؟“

”کیا؟“ شامو نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وہ سوچ رہا تھا‘ میں کتنی ذلیل حرکت کر رہا ہوں۔ شاگی کی ماں نے مجھے دیکھا ہے۔ وہ نمجالے اپنی دل میں کیا سوچ رہی ہو۔ آئندہ میں ان کے سامنے شاگی کو کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔“

شامو اس کی باتیں سن کر کچھ سوچنے لگا۔ ”شامی۔ ایک بات کہوں؟“ وہ کچھ

ایک دوسرے پر جم گئیں۔ شاگی خود کو غلاؤں میں پرواڑ کرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اسے آصف بہت اچھا لگتے لگتا تھا۔ اس کا بی پاپتا تھا کہ وہ اسی طرح بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں۔ آصف کی آنکھیں اسے خاموش زبان سے بہت کچھ کہتی تھیں اور وہ اس کے جواب میں اپنی نظروں کی مسکراہٹ سے آصف کو اقرار دفا کا یقین دلا دیتی۔

وہ ایک دوسرے کی جانب نکلتے رہے لیکن دونوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ شامی آصف کے ہاتھ پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ شامو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شامی کی نظریں جیسے آصف کے دماغ میں گھسی جا رہی تھیں۔

اس نے جیب سے سنٹاہٹ محسوس کی اور شاگی کی طرف سے نظریں سمھاکر شامی کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر وہ گھبرا سا گیا لیکن شامی کے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ اس نے آصف کے ذہن سے شاگی کے متعلق ہر بات، ہر جذبہ اور ہر خواہش کو جان لیا تھا۔ شاگی کو مسکراتا دیکھ کر آصف کچھ اور شرمندہ ہو گیا۔ توڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے اب اجازت دیجئے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے تھے۔

ان سے رخصت ہو کر وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے وقت اس کی نظریں شاگی کے حسین چہرے سے ناراض طور پر ٹکرائیں۔ وہ کچھ بے چینی ہی ہو گئی لیکن وہ کبھی کیا سکتی تھی، پہلو بدل کر رہ گئی۔

شامی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ ”ماں میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ وہ جواب سے بغیر اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ اس وقت شامو کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ شاگی کی مسکراتی نظروں نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔

شامو شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا معاملہ ہے؟

”شام۔ تم نے کچھ دیکھا؟“ کچھ دیر بعد وہ شامو سے بولی۔



دیر بعد بولا۔

”ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم ایسا کرو۔ ان کو کچھ دیر کے لیے تنہائی میں ملنے دو اور خود چھپ کر دیکھتے ہیں، آصف کی فطرت سامنے آ جائے گی۔“

شامی نے کچھ سوچ کر سر ہلادیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ راضی ہو گئی۔

”بس تو یہ کام ہو جائے گا تب آگے بٹاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آگے بھی کوئی بات ہے؟“

”ہاں۔“

”جیسے تم کہو۔“ وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”کچھ دیر غائب لینے کا ارادہ ہے۔ پھر شام کو آصف کے آگے پر اس کے ساتھ اس کے مکان پر جانا ہے۔“

شامو نے سر ہلاتے ہوئے صوفے پر ہی ٹانگیں پھیلا دیں۔ شامی مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی اور شامو۔۔۔ وہ نبالے کیا سوچتے لگا۔

☆○☆

”اور یہ ہے آپ کا کمرہ۔۔۔“ آصف نے تیسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شامو کو مخاطب کیا۔

کمرہ بہت فضاوت اور سادگی سے سجا ہوا تھا۔ ان کو بہت پسند آیا تھا یہ مکان۔ وہ آصف کے بوڑھے باپ سے بھی لے گئے۔ اس نے ان کو بیٹی اور بیٹے کی طرح پیار کیا تھا اور پھر وہ مکان میں اپنے کمرے دیکھنے کے لیے آصف کی رہنمائی میں چل پڑے۔ تمام کمرے نہایت صاف ستھرے اور سادگی سے سجے ہوئے تھے۔ ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔

”کھانے پکانے کا انتظام ایک بڑھیا کرتی ہے اس لیے۔۔۔“

”جی نہیں۔ ہمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ صرف دن میں تین مرتبہ دودھ کی ضرورت پڑے گی۔“

”صرف دودھ؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”جی ہاں۔ میں اور سہیلی دو اکھا رہے ہیں اور اس میں دودھ کے سوا تمام کھانے پینے کی چیزیں بند ہیں۔“ شامی نے مسکرا کر کہا۔

”جیسے آپ کی خوشی۔“ وہ شامی نے اچکا کر بولا۔ ”دودھ آپ کو مل جایا کرے گا۔“ اور وہ سب آصف کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

وہ ہوٹل چھوڑ کر آصف کے مکان میں آ گئے۔ پیسے بہت کم رہ گئے تھے اور ابھی جانے کب تک ان کو یہاں رہنا تھا لیکن شامی اس کی ترکیب بھی سوچ چکی تھی۔

آصف تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی پر چلا گیا اور وہ تینوں شامو کے کمرے میں آ بیٹھے۔ انہوں نے چند دن کے لیے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے اور پھر۔۔۔ وہ ہر خبر سے بے نیاز ہو کر کام کر سکیں۔ اسی لیے آج وہ کہیں نہ گئے۔ آصف نے شوکت کے حلقے ہر قسم کی معلومات میا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہل پل کی خبریں ان کو پہنچا رہا تھا۔

وہ کافی دیر تک بیٹھے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ شامی کافی خوش نظر آ رہی تھی شامی اور شامو اس کی خوشی کی وجہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اپنے محبوب کے کمرے میں تھی۔۔۔ اس کے بہت قریب۔۔۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتی۔۔۔؟

☆○☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پولیس ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو شوکت پر سے تمام پھرے ہٹا لیے گئے اور اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

لیکن شوکت --- وہ اب اس شرم میں رہنے کو تیار نہ تھا۔ وہ ایک بار اپنی کوشی میں جانا چاہتا تھا۔ اس کا سارا کیش کوشی میں تھا۔ ایک سیانے بزنس میں کی طرح وہ اپنا زیادہ روپیہ گھر پر رکھتا تھا۔ بک میں تو وہ اتنا ہی تینٹس رکھتا تھا جو کاروباری لحاظ سے ضروری ہوتا۔ اسے شراب اور عورت کی لت تھی۔ شراب و شباب کی مستیوں میں کم ہو کر اپنے آپ کو بھول جایا کرتا تھا اور یہ دونوں چیزیں اسے صرف دولت سے حاصل ہو سکتی تھیں۔

وہ ہسپتال سے نکل کر جیشہ کے ہاں پہنچا۔ وہ اور اس کی جوان بہن پوش ایریا کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ بھی ماڈرن تہذیب کے دلدادہ تھے اور اسی لیے وہ شوکت کے گھرے دوستوں میں سے تھے۔ ماں باپ، بہن بھائی اور کوئی نہ تھا۔ جیشہ، شوکت کی ل میں میسر تھا۔ اس کی بہن کا نام نجمہ تھا اور نجمہ کی وجہ سے ہی شوکت جیشہ پر خاص نظر کرم کرتا تھا۔

وہ جیشہ کی کوشی میں داخل ہوا۔ تیل دی۔ کچھ دیر بعد ایک نوکر نے دروازہ کھولا۔

”جیشہ ہے؟“ شوکت نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ وہ ابھی مل سے نہیں آئے۔“ اس نے اسے پہچان کر کہا۔ ”نجمہ بی بی اپنے کمرے میں موجود ہیں۔“ نوکر دبے لہجے میں بولا اور شوکت کے انگ انگ میں سستی بھر گئی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔ نوکر دروازہ بند کر کے ایک طرف بڑھ گیا اور وہ نجمہ کے کمرے کے دروازے پر دک گیا۔ اندر سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ اس نے دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے ایک سر ملی آواز ابھری۔

شوکت نے ہونٹوں پر مسکراہٹ نکھیرتے ہوئے کوئی جواب دیے بغیر پھر دروازے پر دستک دی۔

”بہن کون ہے؟“ اندر سے پھر آواز آئی۔

شوکت نے پھر وہی حرکت کی۔

”اوہ کیا مصیبت ہے۔“ بستر پر سے کسی کے اترنے اور پھر فرش پر چپل محسوس کی آواز آئی۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔

”کو۔۔۔“ اس کی آواز رک گئی۔ سامنے شوکت کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”اوہ آپ!“ اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

شوکت مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ نجمہ نے دروازہ بند کر دیا اور اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ہسپتال سے کب آئے؟“

شوکت نے اسے کھینچ کر گود میں گرا لیا۔ ”آج ہی۔ لیکن چھوڑو اس تذکرے کو۔۔۔“ اور وہ اس پر جھک گیا اور۔۔۔ پھر۔۔۔

☆○☆

”نہیں جیشہ۔۔۔ مجھے اب اس کوشی سے خوف آتا ہے۔ تم میرے سیف کی چابیاں لے جاؤ اور تمام روپیہ نکال لاؤ۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے چابیاں نکال کر اسے دے دیں۔

”اور اگر کوئی دہاں مجھ سے کرا گیا تو؟“ جیشہ نے مذاق سے کہا۔

”نہیں۔ تم سے کسی کو کیا پر غاش ہو سکتی ہے۔“

”تو تمہاری کس سے دشمنی ہے؟“

”میری سمجھ میں خود نہیں آتا کہ آخر کوئی میری زندگی کے درپے کیوں ہو گیا ہے؟“ وہ گھر مند لہجے میں بولا۔

”بہر حال اس وقت تو رات کے آٹھ بجے ہیں۔ صبح جاؤں گا۔“ جیشہ نے کہا اور چابیاں جیب میں ڈال لیں۔

”نیک ہے۔“ شوکت نے رضامندی ظاہر کی۔

”کلب چلیں!“ جمید اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو۔“ وہ تینوں کو خمی سے باہر نکل آئے۔ شوکت نے اپنی کار اشارت کی اور جمید اور نجمہ بھی اسی کی کار میں آ بیٹھے۔

کار تیزی سے سڑک پر بھاگنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کلب میں شوکت کی مخصوص میز پر بیٹھے وہاں سے دل بھلا رہے تھے۔ آصف ان کو سرور رہا تھا اور سرور کرتے کرتے اس نے ان کی باتیں بھی سن لیں۔ شوکت جمید کو کانپید کر رہا تھا کہ صبح جا کر اس کی کو خمی سے روپیہ لے آئے۔

اس نے اپنے دماغ میں سنہائٹ محسوس کی۔ ایک اور واقعہ اس کے علم میں آ گیا تھا۔ اب وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر شامو اور شامی کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے جب شوکت اور جمید لڑکھڑاتے ہوئے نجمہ کو ساتھ لیے کلب سے رخصت ہو گئے۔

ان کے تھوڑی دیر بعد آصف بھی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو گیا۔ اس نے ایک ٹیکسی لی۔ کچھ دیر بعد وہ شامو اور شامی کے پاس بیٹھا تھا۔

”تو آج کل شوکت اس فوجوان --- جمید کے ہاں مقیم ہے۔“ شامی نے کہا۔

”جی ہاں۔“ آصف بولا۔ پھر وہ ان دونوں کو کلب میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ انھو شام۔ ہمیں شوکت کی کو خمی میں جانا ہے۔“ ساری بات سن کر شامی نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

وہ کھڑے ہو گئے۔ شاکی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ باہر نکلے۔ آصف کا باپ بھی سو رہا تھا۔ بیچارے کو کبھی بھکاری نیند آتی تھی ورنہ وہ ہر وقت کھالتا رہتا تھا۔ اس بیماری نے اس کی نیند، چین، آرام سب کچھ جھین لیا تھا۔

وہ پیدل ہی ایک طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت کسی ٹیکسی کے ملنے کے امکانات نہیں تھے۔ پھر ٹیکسی پر جانا ان کے لیے سودمند بھی نہ تھا۔ آصف ان کو مختلف

راستوں سے لے کر شوکت کی کو خمی کے قریب پہنچ گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ پولیس نے اپنا سپرہ اٹھا لیا تھا۔ وہ تینوں اندر کودے اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کو خمی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ آس پاس کی کھلیاں اور پٹیلے خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مکمل سناٹے کا راج تھا۔

آصف نے جب سے ٹارچ نکالی اور دروازے پر پڑے ہوئے آٹے پر اس کی روشنی پڑی۔ اس نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا اور جلدی سے ایک کمرے کی کڑکی کی طرف بڑھا۔ شامو اور شامی بھی اس کے ساتھ ہی ادھر بیڑہ گئے۔

آصف نے ٹارچ شامو کو تھما دی اور زمین سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا۔ دوسرے لمحے ایک چھتا کے کی آواز نے سناٹے کی دبیز چادر کو چاک کر دیا۔ کڑکی کا شیش ٹوٹ گیا۔ آصف نے اندر ہاتھ ڈال کر چٹنی کھولی اور وہ باری باری اندر اتر گئے۔ آصف جلدی سے پت بھینچ کر سوچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ بین دبلیا اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ انہوں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی اور قسمت کی مہربانی پر ان کے منہ سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہو گئی۔ وہ شوکت کے کمرے میں کھڑے تھے۔ وہی کمرہ جس میں ایک مرتبہ شامی اس کی زندگی کے بمیاب ترین لمحات کو جنم دے چکی تھی۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آصف آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک طرف دیوار میں بنی سیف کی طرف بڑھ گیا۔ سیف میں ہوا چابی کا سوراخ دیکھتے ہی وہ کچھ سوچنے لگا۔ سیف کو کھولنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ شامو بھی سوچ میں پڑ گیا لیکن شامی بے فکری سے ایک موٹے پر بنی تھی۔ انہوں نے سیف کو کھولنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تھک کر وہ بھی موٹے پر بیٹھ گئے۔

شامی نیم و آکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آصف ان کی ناجائز اور خطرناک سرگرمیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنی محبت، اپنی چاہت شاکی کی وجہ سے ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھا اور شامی اس کے ذہن کو پرکھ رہی تھی۔ پھر شامی کی آواز ابھری۔

”آصف۔“ آصف نے چمک کر سر اٹھایا۔

شامی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آصف کی نظریں شامی کی نظروں سے ٹکرائیں اور اس کا ذہن جھنجھٹا اٹھا۔ شامی کی نظریں --- شعلے برساتی نظریں آصف کے دماغ میں کھسکی جا رہی تھیں۔ اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ سارے جسم میں سے طاقت ختم ہو گئی تھی۔ شامو بھی ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آصف، تم شامی کو چاہتے ہو؟“ شامی کی پرسکون آواز ابھری۔

”ہاں۔“

”تم اس سے کتنی محبت کرتے ہو؟“

”جتنی --- جتنی کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔“ اس کی آواز جیسے کمرے کنویں سے آ رہی تھی۔

”تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”جان دے سکتا ہوں۔“ وہ اسی لہجے میں بولا۔

”تو پھر سنو --- غور سے سنو۔“ شامی کی آواز میں جھکم آگیا۔

”آج کے بعد تم خود کو ہمارا ساتھی تصور کرو گے۔ ہماری کوئی بھی حرکت تمہارے لیے حیران کن نہیں ہوگی۔ میرے اور شامو کے ہر حکم کی تم اسی طرح قبیل کرو گے جیسے حکم نہیں ایک بڑے ساتھی کا کمانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے جذبات، خیالات پر کوئی پابندی نہیں لیکن --- ایک بات اور --- تم ساری زندگی --- مرتے دم تک شامی سے وفا کرو گے۔ اس کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ تم صرف اور صرف اپنے من میں بسی ہوئی شامی کی محبت میں ڈوبے رہو گے۔ سمجھے۔“

”ہاں۔ میں ہر بات پر عمل کروں گا۔“ وہ بے جان سی آواز میں بولا۔

”اب یہ باتیں صرف تمہارے ذہن و دل میں نقش رہیں گی۔ یہ یاد نہیں رہے گا کہ کسی نے تمہیں یہ باتیں کہی تھیں۔ یہ باتیں تمہاری روح کا اٹل حصہ ہیں۔“

”ہاں یہ باتیں میرے دلی جذبات ہیں۔ کسی کا حکم نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم اپنی اصلی حالت میں آ جاؤ۔۔۔ اصلی حالت میں۔“ اس کے ساتھ ہی شامی نے اس کی نظروں سے اپنی نظروں کا تسلس توڑ دیا۔ اس کے دماغ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ لرز کر رہ گیا۔

شامی نے ایک طویل سانس لے کر شامو کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلا رہا تھا جیسے سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہو۔

آصف اب بالکل ٹھیک تھا اور شامی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اب کیا کیا جائے؟“ کچھ دیر بعد آصف بولا۔ اسے چند لمحے پہلے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

”محرمت کرو۔ تم واپس جاؤ۔ شامی گھر پر اکیلی ہوگی۔ صبح ہونے والی ہے۔“ شامی نے کہا اور آصف کوئی بحث کے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ کب تک آئیں گے؟“ وہ دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ اس کے انگ انگ میں خوشیوں کی لہریں کود رہی تھیں۔ وہ شامی سے کل کر بات کر سکے گا۔

”کام ختم کر کے ہم فوراً گھر پہنچیں گے۔“

”بہتر۔“ وہ آہستہ سے کھڑکی سے کود کر نکل گیا۔

شامی صوفے پر شامو کے پاس آ بیٹھی۔ ”کیوں کیا رہا؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”بالکل درست --- شامی کا مستقبل اب محفوظ ہے۔ اب کوئی اندیشہ نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے اسی دن تمہارے اس ارادے کا پتہ چل گیا تھا جب تم نے کہا تھا کہ باقی بات بعد میں بتاؤں گا۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ہوں۔۔۔ تو جناب میرا ذہن بھی پڑھا کرتی ہیں۔“ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ وہ جتنی ہوئی اس کے سینے سے آگئی۔

شامو نے اس کی زلفوں کو چوم لیا اور شامی نے اس کے سینے پر سر رکھ کر



کسی کار کے رکنے کی آواز آئی اور شامو ہچک پڑا۔ اس نے صوفہ کھینچ کر دولت کے ڈھیر پر کٹلی مارے بیٹھی ناگن کے آگے کر دیا۔ وہ اس کی آڑ میں چھپ کر رہ گئی اور خود شامو آہستہ سے دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دروازہ کھلا رکھا اور دیکھنے لگا۔

راہدار میں یں کسی کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر دروازے کے پاس آکر قدموں کی آہٹ رک گئی۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ کوئی اندر داخل ہوا۔۔۔ یہ جیشہ تھا۔

جیشہ نے سوچ بورد پر ٹپٹن دیا اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ساتھ ہی جیشہ کے منہ سے ایک تھیر تھیر آواز نکل گئی۔ وہ تیزی سے سیف کی طرف بڑھا اور جھک کر زمین پر تھے ہوئے دروازے کے سیال کو دیکھنے لگا۔ بھر سیدھا ہو کر اچھی طرح سے ہاتھ مار مار کر سیف میں دیکھنے لگا لیکن سیف بالکل خالی تھا۔ وہ تیزی سے شامو والے کمرے کی طرف بڑھا اور شامو جلدی سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ جیشہ نے پورا دروازہ کھولا اور جلدی سے کوٹے میں تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیے اور بے چینی کے عالم میں کھڑا ہو کر ریسیور کو دبائے لگا۔ پھر اس کی تیز آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ شوکت۔ جلدی کو فحشی پہنچو۔ سیف خالی پڑا ہے۔“  
 ”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ سیف کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی سائنسی ہتھیار سے اسے پھلکا دیا گیا ہے۔“

شامو مسکرا پڑا۔ جیشہ رک گیا اور دوسری طرف سے شوکت کی بات سننے لگا۔  
 ”ایک روپے تک کا نوٹ نہیں ہے وہاں۔ تم فوراً پہنچو۔ ہاں ہاں میں پولیس کو ٹیلی فون کر رہا ہوں۔ تم جلدی آؤ۔ تمہارے آنے تک پولیس آچکی ہو گی۔“

آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر گزر گئی۔

”شامی۔“

”ہوں۔“

”صبح ہو گئی ہے۔“ شامو نے دوسرے کمرے میں پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی پھیلے دیکھ کر کہا۔

”پھر؟“ وہ اسی طرح بولی۔

”ارے پھر کیا۔۔۔ سیف کھولنا ہے اور۔۔۔“

شامی ہولے سے اس سے علیحدہ ہو گئی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ شامو کو کچھ سمجھانا شروع کر دیا۔ اس نے پوری بات سن کر رضامندی کے انداز میں سر ہلا دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔

پھر۔۔۔ چند لمحوں بعد شامو کے سامنے صوفے پر ناگن کٹلی مارے بیٹھی تھی۔ وہ شامو کو دیکھ رہی تھی۔ شامو اٹھ کھڑا ہوا۔ ناگن بھی صوفے سے نیچے ریگ گئی۔ اب وہ سیف کے عین سامنے کھڑی چھن لہرا رہی تھی۔ ہوئے ہوئے پتھار رہی تھی۔ ایک زوردار پتھار گونجی اور کمرے میں ”شوگاما“ کی بازگشت گونج اٹھی۔ ناگن کے منہ سے ایک شعلہ نکلا اور سیف کی طرف اڑتا چلا گیا۔ ناگن نے دو پتھکارتیں اور ماریں اور سیف کی طرف دو شعلے اور اڑے اور پھر سرخ ہوتی ہوئی سیف کا دروازہ کسی سیال کی طرح زمین پر بہہ گیا۔ اب وہاں ایک بڑا سا خلا نظر آرہا تھا جس کے اندر نوٹوں کی گڈیاں اوپر تلے چنی ہوئی تھیں۔ کئی لاکھ روپیہ تھا۔

شامو آگے بڑھا اور زمین پر پڑے ہوئے سیال سے پاؤں پھا کر سیف سے گڈیاں نکالنے لگا۔ صوفے کے پاس زمین پر نوٹوں کی گڈیاں کا ڈھیر لگ گیا۔ ناگن دولت کے ڈھیر پر کٹلی مارے بیٹھی تھی۔ شامو صوفے پر بیٹھ گیا اور دونوں انتظار کرنے لگے۔۔۔ کسی آنے والے کا۔۔۔

اس نے سلسلہ منقطع کیا اور پولیس کو فون کرنے لگا لیکن ابھی اس پہ پہلا نمبر ہی سمایا تھا کہ اس کی آنکھوں میں رنگ برنگے ستارے ناچ اٹھے۔ سر پر پڑے دالی ضرب کچھ اتنی ہی زوردار تھی کہ ریبیور اس کے ہاتھوں سے چوٹ کر کر پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سرھانے کے ستیر کی طرح زمین پر آ رہا۔ شامو نے جیب سے ریٹی سیاہ ردال نکال کر اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک طرف ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے پھر ایسی کمرے میں آ گیا۔ اس نے صوف بٹایا دیا اور اب سامنے دروازے سے جو بھی داخل ہوتا تب سے پہلے اس کی نظر تانگوں پر پڑتی جو دولت کے ڈھیر پر بڑی شان سے کنڈلی مارے بیٹھی اپنے بچن کو دانیں بانٹیں لہرا رہی تھی۔ شامو نے لائٹ آف کر دی اور دروازہ کھول کر راہداری میں آ گیا۔ اب وہ دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس اندھیرے میں کھڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ پھر کوئی بڑی زور سے کار کا دروازہ بند کر کے تقریباً دوڑتا ہوا راہداری میں داخل ہوا۔ یہ شوکت تھا۔ "جیشہ۔۔۔ جیشہ۔۔۔ کہاں ہو تم۔" وہ جیشہ کو آواز دینا ہوا اپنے کمرے کے اوپر کھلے دروازے پر رک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر دروازہ کھول دیا اور سوچے پورڈ پر بٹن تلاش کر کے دبا دیا لیکن۔۔۔ پھر اس کی تیز چھ سے کمرے کی پرسکون فضا دہم دہم ہو گئی۔ وہ دولت کے ڈھیر پر کنڈلی مارے بیٹھے سانپ کو دیکھ کر باہر کی طرف بھاگا لیکن دروازے پر نقاب پوش جتا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک سفید کپڑا بندا ہوا تھا جو شاندار اسی کی چھوٹی میز کا غلاف تھا۔

اس نے خوفزدہ نظروں سے سانپ کو دیکھا جو اب پھنکارنے لگا تھا۔ پھر اس کی نظریں نقاب پوش کی طرف اٹھ گئیں۔ نقاب پوش دونوں ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں ڈالے کھڑا تھا۔ وہ دونوں طرف سے پھنس چکا تھا۔ سامنے نقاب پوش تھا اور پیچھے سانپ۔ دونوں طرف موت تھی۔ نقاب پوش نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ جیبوں سے باہر آ گئے۔ کنڈلیا ہٹ کی آواز گونجی۔ اب اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگا اور شوکت خوفزدہ انداز

میں پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر سانپ کی طرف بھی دیکھتا۔۔۔ ایک ایک صوفے سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اب وہ صوفے پر گرا لیے ابے سانس لے رہا تھا۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں بے تابی سے حرکت کر رہی تھیں۔

نقاب پوش نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے نقاب پوش کا زبردست گھونسا اس کے جڑے کو سلا گیا۔ وہ ایک کمرہ کے ساتھ پیچھے کو گرا۔ اب وہ دولت کے ڈھیر پر پڑا تھا اور سانپ ڈھیر سے نیچے اس کے سر کے قریب بیٹھا پھن لہرا رہا تھا۔

شوکت نے لوگوں کی گڑبگڑ کو دیکھا جو اس کے جسم کے نیچے دبئی ہوئی تھیں۔ سانپ نے ایک زوردار پھنکار ماری اور توغوں کی گڑبگڑ کو آگ لگ گئی۔ شوکت تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی سانپ اور کبھی اپنی جلتی ہوئی دولت کے الاؤ کو دیکھنے لگا۔ شعلے پلندہ ہوتے رہے اور شوکت آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ نقاب پوش ہاتھ میں چاقو لیے زہریلی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

اچانک سانپ اس کی طرف لپکا۔ وہ چیخا ہوا بھاگ نکلا لیکن نقاب پوش نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔۔۔ وہ اونڈے منہ فرش پر آ رہا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور وہ بچوں کی طرح رو پڑا لیکن۔۔۔ نقاب پوش یا سانپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سانپ تیزی سے اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازے کے پٹ سے ٹکرا کر وہ گرے گرے بھا گیا۔ وہ کار میں بیٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ آس پاس کی گلیوں کے لوگوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کیونکہ بڑے لوگ عموماً ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ پھر دوسری گلیاں اس سے کافی فاصلے پر تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار شامو کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ تیزی سے پٹا نوں چاقو بند کر کے جیب میں رکھتا ہوا اندر اندر بھاگا۔ اندر شاہی اپنے اصل روپ میں آ چکی تھی اور لوگوں کی آگ بھجھ چکی تھی۔ شامو نے ایک صوفے پر پڑے

کو چمپا تا ہوا ہوا۔

”ہاں۔“ شامی مسکرا کر بولی۔

”کیا رہا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”کامیابی۔“ وہ آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”لیکن ہوا کیا؟“

”تفصیل بعد میں۔ پہلے ایک کام کرو۔“

”فرمائیے۔“

”جیشید کی کوٹھی پر چلے جاؤ۔ شوکت وہیں گیا ہو گا۔ اس کے اگلے اقدام کے بارے میں معلوم کر کے جلدی لوٹ آؤ۔“ شامو نے کہا۔

”بہتر۔“ وہ کوٹ پر ہٹا ہوا باہر نکل گیا۔

شامو نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور شامی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ مٹی۔ ساری رات جاگے تھے۔ شاکی آئی اور ان کو سوتا جان کر واپس چلی گئی۔

☆○☆

”شوکت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ آصف نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔ وہ قریباً دو گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔

”کیا؟“ شامی چونک پڑی۔

”جی ہاں۔ وہ بہت تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ بدحواسی میں اس کی کار ایک دوسری کار سے ٹکرائی۔ اسے کافی چونٹیں آئی ہیں اور اب وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”لیکن تمہیں یہ سب کہاں سے معلوم ہوا؟“

”جیشید کسی طرح کوٹھی سے نکل کر سیدھا پولیس سٹیشن پہنچا۔ اس نے رپورٹ لکھوائی ہے کہ وہ پولیس کو فون کرنے والا تھا کہ کسی نے اس کے سر پر کوئی

ہوئے لوٹوں کی چار گڈیاں اٹھا کر اور کوٹ کی جیب میں ٹھونس اور شامی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل گئے۔ شامو نے کپڑا اتار کر وہیں پھینک دیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے سڑک پر پہنچ گئے۔ اس نے اور کوٹ اٹار کر اسے بازو پر ڈال لیا۔

ایک خالی ٹیکسی کو روک کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شامو اور شامی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لی اور مسکرا پڑے۔ --- اپنی کامیابی پر ---

ٹیکسی نے انہیں گھر کے باہر دالی سڑک پر اتار دیا۔ شامو نے کرایہ ادا کیا اور وہ اطمینان سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف چل پڑے۔ ---

☆○☆

”سلی۔“ آصف نے شاکی کے دونوں ہاتھ قلم لیے۔ ”میں اباجان کو تمہارے بچا اور امی سے بات کرنے کے لیے کون سا اور پھر۔۔۔“

لیکن شاکی پوری بات سنے بغیر ہی بھاگ نکلی۔

”بھئی۔“ آصف خوشی سے ہانگیں ساہو کر ہٹتا ہوا بستر پر گر پڑا اور --- دوسرے دروازے کے باہر کھڑے ہوئے شامو اور شامی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ان کی باتیں کافی دیر سے سن رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ آصف نے پیار اور جذبات میں آکر صرف ایک بار شاکی کے ہاتھ پکڑے تھے، اس کے علاوہ اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔ ان کو آصف کی بلند کرداری پر فخر محسوس ہونے لگا حالانکہ نہ تو شامی نے اس کے جذبات، خیالات پر کوئی باندی عائد کی تھی اور نہ ہی اس وقت کوئی ان دونوں کے پاس موجود تھا لیکن آصف کے دل کی تنہا صرف شاکی کو دلن بٹا کر اپنے من مندر میں بٹانے کی تھی۔

وہ اندر داخل ہوئے تو آصف بستر سے اتر پڑا۔ ”آگے آپ؟“ وہ اپنی خوشی

جز مار کر بے ہوش کر دیا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ اسی طرح باہر نکل آیا۔ کوٹھی سے باہر نکل کر ایک راگھر سے ہاتھ کھولائے اور فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا۔ پولیس نے اس کی رپورٹ پر کوٹھی پر ریڈ کیا لیکن اسے کوئی ثبوت نہیں ملا، نہ کوئی ایسا نشان ملا جو ظروموں کے خلاف اس کی مدد کر سکے۔ صرف جیلے ہوئے لوگوں کی راگھ ملے۔ اسی اثنا میں شوکت کے ایک میڈیٹ کی خبر ملی اور پولیس نے ہسپتال میں اس کے کمرے پر پہرہ لگا دیا ہے۔ معاملہ اب بت پر اسرار ہو گیا ہے اس لیے اب مقامی پولیس کا تقریباً سارا محکمہ حرکت میں آ گیا ہے۔ میں جیشید کی کوٹھی پر گیا تھا۔ وہاں جیشید کا ملازم مل گیا۔ وہ مجھے جانتا ہے۔ میں اکثر جیشید کے گھر جاتا رہتا ہوں کیونکہ رات کو عام طور پر وہ نشے میں بری طرح ڈاؤن ہوتا ہے۔ اس کی کوٹھی میرے راستے میں پڑتی ہے۔ اسے اس کے گھر پہنچا کر گھر آنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ملازم سے مجھے یہ ساری تفصیل معلوم ہو گئی۔ جیشید اور شوکت کے اس پر اسرار واقعے کے متعلق تو اخبارات کے صفحے بھی نکل آئے ہیں اور اب شوکت سے ملنے کی فی الحال تو کسی کو اجازت نہیں۔ اس نے پوری تفصیل بتا کر دم لیا۔

شامی کچھ سوچنے لگی۔ شامو بڑے غور سے اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔  
 ”میرا کیا کیا جائے؟“ کافی دیر خاموشی میں گزر گئی تو شامو نے زبان کھولی۔  
 شامی نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم ہی بتاؤ۔“ اس نے جواب دینے کی بجائے انسا سوال کر دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب کچھ عرصے کے لیے مکمل طور پر خاموشی اختیار کی جائے۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔“ شامو نے کہا۔

”ہوں۔“ شامی نے کہا۔ ”تم مجھے ٹھیک کہتے ہو لیکن اس کے لیے ہمیں ایک ایک پل کی خبر رکھنا پڑے گی۔“

”یہ تو بہت مشکل ہے۔ خود کو خطرے میں ڈالنے والی بات ہے۔“ آصف نے نفی میں سر ہلایا۔

”بہر حال اس پر بعد میں سوچیں گے۔ تم فی الحال شوکت کی خبر گیری کرنے کے بجائے اس سے ملنے کی کوشش کرو۔ تم اس کے خاص و دیگر ہو۔“ شامو نے کہا۔  
 ”یہ ہو سکتا ہے۔۔۔ لیکن مجھے اس سے مل کر ناکیا ہو گا؟“  
 ”کچھ نہیں۔ صرف یہ دیکھنا ہے کہ کس حال میں ہے؟“  
 ”اب تو کل ہی جاؤں گا۔“ آصف سوچ کر بولا۔  
 اور سب اس بات پر متفق ہو گئے۔



”میں شوکت صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“ آصف نے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے پولیس افسر سے کہا۔  
 ”تم۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔ کیا نام ہے ہمارا؟“ وہ اسے مشتعل نظروں سے دیکھ کر سخت الجھے میں بولا۔

”آصف علی۔“ آصف بولا۔

”تم شوکت صاحب کو کیسے جانتے ہو؟“

”وہ میرے پرانے مہمان ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کیا مطلب؟“ پولیس افسر دیکھنے سے بولا۔

”جی۔۔۔ مطلب یہ کہ میں۔۔۔ وہ ریٹا کلب کے مستقل ممبر ہیں اور میں ان کا مخصوص و دیگر ہوں۔ وہ مجھ پر خاص طور سے مہمان رہتے تھے۔ میں ان کے احسانات کا بدلہ تو نہیں دے سکتا لیکن اس مصیبت کے وقت میں اگر ان کے کچھ کام آسکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“  
 ”لیکن لباس سے تو تم و دیگر نہیں لگتے۔“

”جناب۔۔۔ یہ سب شوکت صاحب جیسے مہمانوں کی عادت ہے۔“

”ہوں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم ریٹا کلب کے و دیگر آصف علی ہو؟“ پولیس



افسر اب بھی اسے ملکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

آصف نے جیب سے اپنا کلب کارڈ نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ پولیس افسر نے شامی کارڈ سے تصدیق کی۔

”ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے لیکن تم شوکت صاحب سے نہیں مل سکتے۔“ وہ بڑے رعب سے بولا۔

”جی۔۔۔ وہ کیوں؟“

”ان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ کسی کو ان سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔“

”لیکن۔۔۔“

”یہ اوپری احکام ہیں۔“ وہ درشتی سے اس کی بات کٹ کر بولا۔ آصف باپوس ہو کر مڑنے لگا کہ شوکت کے کمرے کے دروازہ کھلا اور جمشید باہر نکلا۔

”جمشید صاحب۔“ آصف نے امید کی ایک ہلکی سی کرن چمکتی دیکھی۔

”ارے آصف۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”صاحب۔۔۔ میں شوکت صاحب کی خبر لینے آیا تھا لیکن۔۔۔“ اس نے رک کر پولیس افسر کی طرف دیکھا جو جمشید کی طرف متوجہ تھا۔

”آپ اسے جانتے ہیں جمشید صاحب۔“ پولیس افسر نے غوت سے کہا۔

”جی ہاں۔ اچھی طرح۔“ اور جمشید نے بھی آصف کے بارے میں وہی

تفصیل دہرا دی جو وہ چند سال پہلے اسے بتا چکا تھا۔ پھر وہ آصف سے مخاطب ہوا۔

”ہاں بھئی آصف۔ شوکت کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس سے کوئی منگتو

۔۔۔ لیکن ابھی اس کا قہرہ نامکمل ہی تھا کہ اندر سے شوکت کے زور زور سے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔

جمشید اندر کو بھاگا۔ پولیس افسر اور دونوں سپاہی بھی تیزی سے اندر کو

دوڑے۔ ان کے ساتھ ہی آصف بھی کمرے میں گھس گیا۔

شوکت بستر پر اچھ رہا تھا۔

”سانپ۔ سانپ۔۔۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ آہ۔۔۔ سانپ۔۔۔ سانپ۔“

جمشید اس کے بچوں سے ڈھکے جسم پر جھک گیا۔ ”شوکت، ہوش میں آؤ۔ دوست، یہاں کوئی سانپ نہیں ہے۔ دیکھو۔۔۔ میں جمشید ہوں۔“ اس نے شوکت کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

شوکت ”سانپ۔ سانپ“ چیخا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے دھت لٹایاں تھیں۔ پھر وہ خوفزدہ نظروں سے اوجھل دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے لیکن اب اس کی آواز سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھی۔ اسی طرح سرگوشی کے عالم میں سانپ سانپ پکارتا ہوا وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایک ہیڈنٹ کے بعد پہلی بار ہوش میں آیا تھا۔ کمرے کے دروازے سے دو تین ڈاکٹر اندر داخل ہوئے اور جمشید شوکت کے بستر سے اٹھ گیا۔

”آؤ آصف۔“ چلیں۔“ جمشید نے آصف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور آصف شوکت کے زخمی جسم اور دھت زدہ چہرے کو دیکھتا ہوا باہر نکل آیا۔

”دیکھا تم نے۔ وہ حادثے کے بعد پہلی مرتبہ ہوش میں آیا تھا لیکن سانپ کی دھت نے اس کے ذہن کو پوری طرح قابو میں کر رکھا ہے۔“ جمشید نے انہوں سے بھرے لیجے میں کہا اور آصف سر ہلا کر رہ گیا۔

”اچھا صاحب۔“ مجھے اب اجازت دیجئے۔ رات کو کلب آئیے گا ناں؟“

”ضرور بھئی۔ کلب تو اپنی جان ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا اور آصف یہ سوچتا ہوا ہسپتال سے باہر نکل آیا کہ یہ کیسے دوست ہیں۔ ایک دوست موت کی دہلیز پر کھڑا ہے اور دوسرا دوست جو اسی کی دولت پر عیش کرتا ہے، اسے تنہا چھوڑ کر عیاشی کے لئے چپ ہے۔

لے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اس کی حالت سے تو ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ سانپ کی دہشت نے اس کے دل و دماغ پر مکمل قبضہ جما رکھا ہے اور اب وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچنے پر قادر نہیں ہے۔“ آصف نے کامورا سب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

کچھ دیر بعد وہ بحث کر رہے تھے۔ سب اپنی اپنی رائے کا آزادی سے اظہار کر رہے تھے۔ شاکی چپ چاپ بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے ان کی کسی بات میں دخل نہیں دیا تھا پھر۔۔۔۔۔ وہ سب ایک نقطے پر متفق ہو گئے کہ کچھ عرصے کے لیے خاموشی اختیار کر لی جائے۔ بعد میں حالات کے تحت اگلا قدم اٹھایا جائے۔

☆○☆

دوبہنے لگے۔

شاکی اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ آصف ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شامی، شامو کے کمرے میں بیٹھی تھی اور دونوں آصف کا انتظار کر رہے تھے۔

شامو وہ دونوں بھی تھوڑی دیر بعد نیند کی آغوش میں پہنچ جائے کہ آصف کے باپ کو زور سے کھانسی آئی۔ وہ دونوں چونک پڑے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سرگرا پڑے۔ شامی نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ایک جھاتی لی اور بستر سے اتر آئی۔

اب وہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ شامی نے اپنا سر شامو کے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ شامو صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے سامنے میز پر ٹانگیں پھارے لیٹا تھا۔ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ شامو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اندر آیا تو آصف بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر آصف نے ان کو ایک ایسی خبر سنائی۔۔۔ جس کا انہیں بے تابی سے انتظار تھا۔

”شوکت کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا ہے اور آج وہ پہلے دن کلب آیا تھا

۔۔۔ اور ایک بات بتاؤں آپ کو۔“ آصف نے ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ وہ ایک زبان بولے۔

”آج پہلے دن وہ کلب آیا اور آتے ہی پھر اپنی عیاشیوں میں مشغول ہو گیا۔ پوری بوٹی و ہنسی کی چڑھا گیا۔ جب وہ کلب سے رخصت ہوا تو اس کی بغل میں نچھڑا تھا۔“

”وہ گئے کہاں؟“

”جیشید کے گھر۔ شوکت اب تک وہیں مقیم ہے۔ اور جیشید۔۔۔۔۔ وہ بزنس ٹور پر ایک ہفتے کے لیے ملکہ سے باہر ہے۔“

شامی نے نفرت سے ہونٹ سکڑ لیے۔ اس نے شوکت، نچھڑا اور جیشید اور اسی قسم کی ہزاروں بدردعوں کے لیے دل میں بے پناہ نفرت ابھتی ہوئی محسوس کی۔

شامی اب مزید انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ آصف نے اسے بتایا بھی کہ پولیس شوکت کی طرف سے غافل نہیں ہے لیکن اب اور ممبر اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ جلد از جلد اس قصے کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ شاکی کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکتا تھا اور شاکی کے مخصوص دونوں کی آمد میں ابھی بارہ دن باقی تھے۔ لہذا شامی اسنے دن خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ پہلے ہی کافی دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے گزر چکے تھے اور اب مزید خاموشی شامی کے لیے سہانہ روح سے کم نہ تھی۔ اسی لیے اس نے اچانکے روز کے لیے پروگرام مرتب کر لیا۔

☆○☆

آصف صوفے پر بیٹھا کھائے پی رہا تھا کہ شامی نے اس کی طرف محور کن نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلوں کی دو باریک کیریں نکلیں اور آصف کے سر سے گزرا گئیں۔ آصف کے ہاتھ سے چائے کا کپ فرش پر گر پڑا اور وہ بے خود سا ہو کر شامی کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ شامی کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا۔

”آصف۔ میں شامی سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔ وہ شوکت سے محبت کا ٹانگ کھیلے گی۔ تم اس کے کام میں رکاوٹ نہیں بنو گے۔ تم اسے کچھ عرصے کے لیے بھول جاؤ۔ اس دقت تک جب تک میں چاہوں۔ تم اس سے کوئی سروکار نہیں رکھو گے۔ اب تم جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔“

☆○☆

”شامی۔“

”ہاں۔“ اس کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔  
”تجھے میرے حکم پر ایک کام کرنا ہے۔“ اور شامی خاموش رہی جیسے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہی ہو۔

”آج۔۔۔ ابھی جب ہم کلب پہنچیں گے تو تو شوکت سے ملے گی۔ تو اسے اپنے حسن کا گردیدہ بنائے گی اور۔۔۔“ شامی نے اپنا مکمل پروگرام اس کے دماغ میں فیز کر دیا۔ شامی نے قہقہے کی حالی بھری اور شامی مطمئن ہو گئی۔ اسے چند دنوں کے اندر اندر اپنا کام ختم کرنا تھا۔ صرف چند دنوں میں۔۔۔

وہ باہر نکلے۔ آصف جا چکا تھا۔ ٹیسی میں بیٹھ کر وہ کلب پہنچے اور ایک کبھین میں براہمان ہو گئے۔ آصف اندر داخل ہوا۔

”شوکت آگیا ہے۔“ آصف نے ان کو خبردار کیا۔ آصف نے شامی کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔

شامی نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ شوکت اپنی میز پر تنہا بیٹھا تھا۔ ہلکے براؤن رنگ کے سوٹ میں وہ خاصا دلکش لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی بے رونق ختم ہو چکی تھی اور اب وہ پھر وہی شوکت تھا۔

”شوکت کی میز سے چوتھی میز پر پولیس کے آدمی ہیں۔۔۔ سادہ کپڑوں میں۔۔۔ اور اسی لیے وہ اس قدر بے لگڑ ہے۔“ آصف نے اشارے سے بتایا۔

”اوہ۔“ شامی نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے ہر اندیشے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

آصف دوسری میزوں کی طرف جا چکا تھا۔ آج وہ شامی سے بالکل بے اعتنا تھا۔ شامی نے شامی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ پا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مجسم سامان قفل تھی۔ چست کپڑوں میں اس کے جسم کا انگ انگ نمایاں ہو رہا تھا اور شوکت کی نظروں سے ایسا حسن شائد ہی کبھی گزرا ہو۔ وہ آہستہ سے کبھین سے باہر نکلی اور تھوڑی دیر بعد وہ شوکت کی میز کے قریب کھڑی تھی۔

”میں میاں بیٹھ سکتی ہوں۔“ اس نے شیریں آواز میں کہا۔

”جی۔“ شوکت نے سر اٹھایا اور دیکھا ہی رہ گیا۔ اس کے دل پر چھریاں سی چلی گئیں۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔ وہ تو ایک تک شامی کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ اسے اس طرح دیکھنے کا شرما گئی اور شوکت کا دل قابو سے باہر ہو گیا۔

”پھینچے۔“ وہ چونک کر بولا۔

”شریہ۔“ شامی بیٹھ گئی۔

”کیا بیٹھ گئی آپ۔“ وہ قربان ہو جانے والے انداز میں بولا۔

”جی نہیں۔ میں بیا نہیں کرتی۔“

”اوہ۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ کچھ نہ کچھ۔“ وہ اصرار کرنے لگا۔

”جی نہیں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ اس دقت کسی بھی چیز کی حاجت نہیں ہے اور پھر میں شام کے بعد صرف دودھ پیا کرتی ہوں۔“

”اوہ۔ بہت خوب۔“ اس نے دودھ کا آرڈر دے دیا اور خود اپنے سامنے پڑی بوتل کا ڈمکن کھولنے لگا۔ دوسرے لمبے جام اس کے ہونٹوں سے آگلا۔

بوتل خالی ہو گئی۔ وہ ہنسنے لگا۔ شامی نے اسے اپنا نام سسلی ہی بتایا تھا۔

”سسلی۔۔۔ تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔۔۔ میں تمہارے حسن۔۔۔ کا دیوانہ

ہو گیا ہوں۔“ وہ نٹس میں ہنسنے لگا۔

اس نے شامی کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ شامی کی گھبرائی ہوئی نظروں سے

کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکنا۔ شوکت صوفے پر بیٹھا شراب پی رہا تھا اور شاکی اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھی بے چینی سے پہلو بدلی رہی تھی۔ وہ بار بار ادھر ادھر دیکھنے لگتی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

”آپ کچھ گھبراہٹ ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا بات ہے۔۔۔ اور ابھی تک آپ نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا۔ آپ کون ہیں۔۔۔ کہاں سے آئی ہیں۔۔۔ کہاں رہتی ہیں؟“

”آپ نے تو ایک دم سے اتنے سوال کر دیے ہیں۔ اب میں کس کس کا جواب دوں۔“ شاکی نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے شوکت کی طرف دیکھا۔

”ہااا۔۔۔ اف تو یہ۔۔۔ آپ کی آواز کی مٹھاس میرے دل کی گھرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔۔۔ ہااا۔۔۔ آج سے پہلے کبھی آپ ایسی حسین لڑکی میرے خوابوں میں بھی نہیں آئی۔۔۔ بخدا آپ بہت خوبصورت ہیں۔۔۔ اللہ قسم۔“ شوکت نے بڑے لاڈ سے شاکی کے دائیں رخسار پر دو انگلیوں کی ہلکی سی چپت مارنے ہوئے کہا۔ ”اچھا اپنا نام تو بتائیے، مجھے تو شوکت کہتے ہیں اور آپ کو؟“

”سلٹی۔“

”اف۔۔۔ مار ڈالا۔۔۔ ہااا۔۔۔ بڑا خوبصورت نام ہے۔“ اس نے جیک حلق میں اڑھتے ہوئے آگے کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ”لیکن آپ کا نام آپ کی حسین صورت سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکا۔۔۔ اللہ قسم۔“ اس نے شاکی کے ہونٹوں پر اپنی دو انگلیوں رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کہاں رہتی ہیں؟“

”میں یہاں اپنی باجی کے پاس آئی ہوں۔ ہم بھاڑ پر رہتے ہیں۔ میری باجی اسی شہر میں رہتی ہے۔ آج میں سیر کے لیے نکل تو تھک کر اس ہوش میں داخل ہوئی۔ آپ ہی مجھے ایک ایسی شخصیت نظر آئے جن کی رفاقت میں مجھے ان سکون مل سکتا تھا۔ اسی لیے میں بلا تکلف آپ سے ہلکام ہو گئی۔ پھر جب میں آپ کی کار میں بیٹھ

ادھر ادھر دیکھا لیکن لوگ تو اس سے بھی زیادہ گرمی ہوئی حرکتوں میں مصروف تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ شوکت ہنس پڑا۔ کمرہ سی خاموشی۔ اس نے جیب سے پرس نکالا۔ ایک بڑا نوٹ نکال کر شراب کی بوتل کے نیچے دھپایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”آئیے۔ آپ کو اپنا غریب خانہ دکھاؤں، وہیں چل کر ہاتس کریں گے۔“ اس نے شاکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس نے شوکت کا ہاتھ تھامنے سے گریز کیا۔ وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بڑے دروازے سے باہر نکل گئے۔ شامو اور شاکی پہلے ہی باہر جا چکے تھے۔ ان کے باہر نکلنے ہی دونوں پولیس والے بھی کھڑے ہو گئے۔

شوکت شاکی کے ساتھ کار میں سوار ہوا۔ وہ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کار، کلب کپاؤڈ سے باہر نکلی اور اس کے پیچھے ہی پولیس والے بھی پھنکڑا سی جیب میں باہر نکلت پڑے۔ شاکی اور شامو ان سے پہلے ہی اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ جس وقت شوکت کی کار جمید کی کوٹھی میں آکر رکی اسی وقت دوسرے ساتھ والی کوٹھی کی آڑ سے نکل کر اس کی کوٹھی کی دیوار سے چپک گئے۔ پولیس والوں کی جیب کچھ دیر تک وہاں رکی۔ پھر وہ بھی واپس چلے گئے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کر چکے تھے۔

ان کے جاتے ہی دونوں سائے تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر آ گئے۔ کار ایک طرف کھڑی تھی۔ ساری کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف کوٹے کے ایک کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ کمرہ شوکت کا تھا۔ جمید ملک سے باہر تھا اور بجہ۔۔۔ صبح سے غائب تھی۔

شامو نے شاکی کی طرف دیکھا۔ وہ کنڈلی مارے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس نے اسے زمین سے اٹھا کر اوپر کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پھاٹک پر چڑھ کر آہستہ سے دوسری طرف کود گیا۔ بلکی سی آواز ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر جھکا جھکا روشن کمرے کی طرف چلنے لگا۔ کمرے کے قریب پہنچ کر آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے

انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

شامو نے ہونٹ سمجھنے لگے۔ اس نے کھڑکی کے پت کو دھکا دیا۔ اتفاق سے وہ کھلی ہوئی تھی۔ پت کھل گیا۔ اس نے جلدی سے اوپر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر وہی ہاتھ کھڑکی سے اندر کر کے جھک دیا۔

شوکت شاکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شاکی صوفے سے اٹھ کر پیچھے ہٹے گی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ ڈھانپ رکھا تھا۔

شوکت اس کی طرف بڑھتا رہا۔ بازو پھیلائے، کسی درندے کی طرح۔۔۔ اور شاکی۔۔۔ ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔ بے بس ہتھی کی طرح۔۔۔ جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔ اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں طرف سر نہا شروع کر دیا اور شوکت ہٹتا ہوا اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔

”ارے میری جان۔ تڑپا کیوں رہی ہو۔ دیکھو اب مذاق ختم کرو اور میری آغوش میں آ جاؤ۔“

اب وہ شاکی سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ شاکی نے ترم آہستہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں ناجاتی ہوئی شیطانیت دیکھ کر اس کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اس نے ایک بار پھر ادھر سر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر۔۔۔ اس کے چہرے پر جیسے طمانیت کے آثار پھیل گئے۔ اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔۔۔ خود ہرو کی کے عالم میں۔

شوکت کے ہونٹوں پر ایک کرسر مسکراہٹ بکھر گئی اور شاکی کو آغوش میں لینے کے لیے اس نے آخری قدم بڑھا دیا۔ لیکن اسے یہ قدم بہت ہی منگ پڑا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھا دیا۔۔۔ پھر ایک ہی جھٹکے سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی دلدوز چٹخیں دیواروں سے کھرا کھرا کر دم توڑنے لگیں لیکن اس کی گردن میں لپٹی ہوئی ناگن اپنا حلقہ تنک کرتی چلی گئی۔ اس کا دم جھٹکے لگا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر ایلنے لگیں۔ سارے جسم کا خون سٹ کر چہرے پر آ گیا۔ اس نے

رہی تھی تو دو غنڈے مجھے بھوک اور کھا جائے والی غموں سے گھور رہے تھے۔“

”ہااا۔۔۔ وہ غنڈے۔۔۔ آپ نے مجھے دیں کیوں نہیں بتا دیا۔ آپ دیکھتے ہیں ان کا کیا حشر کرتا۔ میرے دو باؤں کا رڈوہاں اس وقت میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ میں انہیں گرفتار کروا دیتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ بڑا اچھا ہوا کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا ورنہ اگر کسی اور عیاش آدمی کے ہتھے چڑھ جاتیں تو پھر ان دو غنڈوں کی بجائے بیسیوں غنڈے آپ کی اس سمور کن جوانی سے کھیلنے۔۔۔ اب۔۔۔ اب تو صرف میں اکیلا یہ کھیل سکیں گا۔۔۔ ہااا۔۔۔ ہااا۔۔۔“ شوکت نے باقی بچی ہوئی آدمی بول کر منہ لگایا اور غصاٹ پئی گیا۔

”نہیں نہیں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔“ شاکی تھکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے میری باقی کے پاس واپس پہنچا دو۔ وہ میرے لیے پریشان ہوں گی۔“ اور ساتھ ہی شاکی کی نظریں کمرے میں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ اسے شاکی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ ابھی تک دکھائی نہ دی تھی۔ اسے غصہ پیدا ہو گیا کہ اگر شوکت نے دست درازی شروع کر دی تو۔۔۔

”درو نہیں مجھ سے سہلی۔ میں تمہیں صرف پیار کروں گا اور بس۔۔۔ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ تم نے۔۔۔ تمہارے حسن نے۔۔۔ تمہاری اس معصومیت نے میرے ذہن کو جمجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ میں صبح ہی تم سے شادی کر لوں گا۔۔۔ پھر ہم دونوں میاں بیوی کے روپ میں تمہاری باقی کے پاس چلیں گے۔ وہ بہت خوش ہوں گی کہ اس کی نصی میں شہر کے کردو پتی سیٹھ شوکت کی بیوی بن گئی۔“

شوکت نے بولتی خالی کر کے فرش پر لڑکھادی اور اٹھ کر شاکی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھاد رہے تھے۔ منہ سے شراب کے مہمو کے اڑ رہے تھے۔ شاکی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آؤ میری جان۔۔۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ مجھ کو سکون دو۔“ اس نے دونوں بازو اس کی طرف پھیلا دیے اور شاکی کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے خوفزدہ

پوری قوت صرف کرتے ہوئے اسے اپنے گلے سے اتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ناگن نے خود کو اس کی گردن کے گرد دس رکھا اور اس کا منہ شوکت کے ماتھے کے قریب تھا۔ وہ پتھار دہی تھی لیکن اس کی پتھاریں شوکت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی تھیں۔ یہ شائد اس کی اپنی مرضی تھی لیکن۔۔۔ شوکت کی دہشت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی چیخیں رکنی جلی گئیں اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ناگن نے کچھ دیر انتظار کیا لیکن جب اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو وہ اس کے گلے کے گرد سے اپنے بل کھینچ کر فرش پر آگئی۔

شامی جو بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی اسے فرش پر آتے دیکھ کر اس کی طرف بدھی اور اسے فرش سے اٹھایا۔ ناگن اس کے بازو کے گرد لپٹ گئی۔ پھر اس نے پیار سے اپنا بچن بڑھا کر شامی کے ماتھے پر پتھارے ہوئے بوسہ دیا۔ کھڑکی میں کھڑا شامو اپنی بھل میں جسد کے ملازم کی گردن دبائے ہوئے تھا۔ وہ شوکت کی چیخیں سن کر آیا تھا لیکن شامو نے اسے راستے میں ہی چھپ لیا اور پھر اسے گھسیٹا ہوا کھڑکی کے پاس لے آیا تاکہ اندر کی صورت حال سے بھی آگاہ رہے۔ وہ کب کا بے ہوش ہو چکا تھا لیکن شامو کو تب ہوش آیا جب کمرے کے اندر ڈراپ سین ہو گیا۔ اس نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے ملازم کی گردن چھوڑ دی۔ وہ دسم سے زمین پر گر پڑا۔

”شامی۔“ شامو نے اسے پیار سے پکارا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔ شامو نے ناگن کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شامی کے کان میں آہستہ سے کچھ کہنے لگا۔

شامی سر ہلاتی رہی۔ تب شامو نے اپنی انگلی سے دیو ناک دی ہوئی انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پتھادی۔ انگوٹھی کے پٹنے پر شامی نے جیسے براندیش کو اپنے ذہن سے دور بھاگتے پایا۔

شامو نے آسمان کی طرف دیکھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ اس نے ایک بار پھر شامی کو اچھی طرح سمجھایا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیکھ کر اسے پرے جانے کا اشارہ کیا۔ شامی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دیوار کے ساتھ جاگتی۔ اس نے ایک بار پھر شامو کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلادیا۔

پھر۔۔۔ شامی ہولے ہولے فرش پر آئی اور بوسے پیار سے لیٹ گئی۔ اب وہ بھی شوکت سے کچھ دور فرش پر بے ہوش ہو جانے والے انداز میں پڑی تھی۔

شامو نے پراطمینان انداز میں سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔ ناگن کو اور کوٹ کی جیب میں ڈالا اور تیزی سے کوششی سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے اور کوٹ کی جیب سے ناگن کو نکال کر زمین پر ڈال دیا۔ چند لمحوں بعد۔۔۔ وہ دونوں۔۔۔ شامو اور شامی۔۔۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اندر میرے میں گم ہو گئے۔

☆○☆

”میں یہ شر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔“ شوکت خوفزدہ انداز سے کمرے میں نظریں دوڑاتا ہوا بولا۔ شامی اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ شوکت پہلے ہوش میں آیا تھا۔ پھر اس نے بے ہوش شامی کو ہوش دلایا۔ اب وہ شر چھوڑ کر بھاگنے کی فکر میں تھا۔

”آپ پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کرتے؟“ شامی نے مشورہ دیا۔ ”پولیس۔۔۔ پولیس اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ وہ صرف پرہ دے سکتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں آج ہی پہاڑ پر اپنے بچکے پر چلا جاؤں گا۔ آج ہی۔۔۔ بلکہ ابھی۔ تم میرے ہمراہ چلو گی؟“

”نہیں۔ میں اپنی بائی کے پاس جاؤں گی۔“ شامی خوفزدہ سی کھڑی ہو گئی۔ ”ضرور جانا۔ مگر ابھی نہیں۔ فی الحال تم میرے ساتھ پہاڑ پر چلو گی۔“ شوکت نے ہوس انگیز پیار سے سسلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ سے خوف آتا ہے۔“ سسلی اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔ ”رات تو آپ نے مجھے بربادی کر دیا تھا کہ وہ سانپ آپ پر حملہ نہ کر دیتا تو۔۔۔ شاید خدا نے میری حفاظت کے لیے فرشتہ بھجوا دیا تھا۔۔۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ مجھے میری بائی کے پاس چھوڑ آئیے۔ میں بائی کے پاس جاؤں گی۔“ سسلی چرو ڈھانپ کر رونے لگی۔

وہ بڑا اچھا کردار اور کریم تھی۔ شامی کی عین فضا کے مطابق۔ سانپ کا ذکر سن کر شوکت کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ اپنی سوزش زدہ گردن پر ہاتھ بھیرنے لگا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔ اس وقت میں اس حالت میں نہیں ہوں کہ تمہاری بائی کے پاس لے چلوں۔ میرے اپنے

حالاں کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”کیا ہے؟“ وہ مردہ لہجے میں زندگی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

حالاں اپنی گردن دونوں ہاتھوں سے دبا رہا تھا جیسے چوٹ آگئی ہو۔ ”صاحب“ آپ تو ٹھیک ہیں ناں؟“

”ہاں۔ کیوں؟“

”میں رات آپ کی چیخوں کی آواز سن کر آیا کہ۔۔۔“ اور اس نے پورا واقعہ دہرا دیا۔ شوکت کچھ اور خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے اس کی تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے حکم دیا۔

”میرا سوٹ کیس تیار کرو۔ میں جا رہا ہوں۔“

”کہاں صاحب؟“

”کیس بھی۔ جو کہا ہے وہ کرو۔“ وہ سختی سے بولا لیکن اس کی آواز میں سختی کم اور خوف زیادہ تھا۔ حالاں سر جھٹکے باہر چلا گیا۔

جاتے جاتے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے امیر لوگ ہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے شہر سے بھاگ رہے ہیں اور حالاں ”فکر“ خادم۔۔۔ جو ان کی جان کی خاطر رات بھر سردی میں غصہ کرتا رہا بے ہوش پڑا تھا اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اسے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔ سردی میں پڑے رہنے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہو گئی۔

شوکت فون کرنے لگا۔ وہ ریسپور کان سے لگائے کھڑا تھا کہ اسے پھر چوکتا پڑا۔ دروازہ کھڑک رہ گیا۔ ”سلام صاحب۔“

”کون؟“ وہ غڑا۔

”جی۔ میں آصف ہوں۔“ دروازے میں کھڑے آصف نے کہا اور صوفے پر بیٹھی شاکی کے دل کی دھڑکنوں میں خوشی کے طوفان کو نہیں لینے لگے۔ اس نے مڑ کر آصف کی طرف دیکھا اور دونوں کی نظریں الجھ کر رہ گئیں۔۔۔ آصف تو جیسے اسے جانتا ہی نہ تھا۔

”اوہ آصف۔ آؤ آؤ۔ کیسے آئے؟“ شوکت مسکراتے ہوئے بولا۔

”صاحب۔ آج کلب میں ایک نئی راقصہ ڈانس کر رہی ہے۔ اٹلی کی مشہور راقصہ۔۔۔ روشیا۔ ضرور آئیے گا۔ میں یہی بتانے آیا تھا۔“ آصف نے کہا اور شاکی مسکرا پڑی۔

”تو پھر ہم ضرور تمہاری باتی کے پاس چلیں گے۔ انہیں دیکھیں گے اور پھر دیکھیں گی وہ جائیں گے۔ اب تو چلو گی تا میرے ساتھ؟“ شوکت نے ایک بار پھر سٹپٹی کو پیشے میں اتارے ہوئے کہا۔

”لیکن میرا دل نہیں مانتا شوکت صاحب۔ رات میں آپ کا بھانجنا روپ دیکھ چکی ہوں۔ یہاں تو مسافرنے مجھے بچا لیا لیکن ہاڑ پھرنے کون بچائے گا۔ وہاں تو ہر طرف آپ کا ہی راج ہو گا۔ میری وہاں کیا بسلا ہو گی۔“

”ارے کبہ جو دیا کہ اب کچھ نہیں ہو گا۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ میں تو کچھ دن سکون سے گزارنا چاہتا ہوں اور بس۔۔۔ اور یہ سکون مجھے ہاڑی پھٹنے کے سوا اور کچھ نہیں لے گا۔ بس حالات سازگار ہوتے ہی تمہیں تمہاری باتی کے پاس لے چلوں گا اور پھر مجھے تو خود بھی تمہاری باتی سے ملنے کی بڑی آرزو ہے۔ بڑی تنہا ہے۔ تم سے زیادہ خوبصورت شے بھی کیا شے ہو گی۔ سٹپٹی، خدا کے لیے مان جاؤ۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ اللہ قسم۔۔۔ اب دھوکہ نہیں دوں گا۔“ شوکت منت سماجت کرنے لگا۔ اور شاکی خوش ہو گئی۔ صرف شوکت کو دکھانے کے لیے۔ شوکت۔۔۔ اپنے باپ کو دکھانے کے لیے۔۔۔ بیٹی۔۔۔ اور۔۔۔

”باب۔ عاشق اور محبوبہ۔۔۔“

”فہمرو۔ میں سٹیپٹن ریپورڈ کرتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ اسے کسی نے پکارا تھا۔

”صاحب۔“

وہ دروازے کی طرف ہٹا۔۔۔ خوفزدہ انداز میں۔۔۔ لیکن دروازے پر

☆○☆

شانی نے آصف سے کہا کہ وہ جیشہ کی کوٹھی پر جاکر شوکت سے ملے اور اسے باتوں میں لگا کر اس کی ساتھی لڑکی سے پیغام حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ شانی نے اسے بتایا تاکہ وہ لڑکی دراصل اپنی سہیلی ہوئی ہے۔ وہ بتا دے گی کہ شوکت اب کیا کرنا چاہتا ہے۔ جب آصف نے واپس آکر پیغام دیا تو ---  
 ”تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں بھی روانہ ہو جانا چاہئے۔“ شانی نے تیزی سے کہا۔

”ہاں۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“ آصف نے کہا۔

شامو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے جلدی جلدی ایک چھوٹے سے بیک میں ضروری چیزیں اور چند جوڑے کپڑے رکھے اور روانہ ہو گئے۔ آصف نے ایک تجویز پیش کی اور وہ سب متفق ہو گئے۔ وہ جیشہ کی کوٹھی پہنچے۔ شوکت کی کار وہاں موجود تھی۔ وہ جا چکے تھے۔ آصف نے ملازم کو ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ شاید اندر کہیں مصروف تھا۔ اس نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا۔ انجین میں چابی موجود تھی۔ شوکت کار میں چابی شاید جیشہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے کار اشارت کی اور بیک کر کے اسے باہر لے آیا۔ شامو اور شانی کچل سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار تیزی سے چٹنی سڑک پر پھسلنے لگی۔ شامو کے پوچھنے پر آصف نے کہا کہ شرم میں صرف ایک ہی کوچ سٹینڈ ہے جہاں سے مل سٹیشن کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ جلدی کوچ سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ شوکت اور شانی انہیں دور سے ہی نظر آ گئے۔ شوکت کی نظریں بے چینی سے ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں جیسے وہ کسی سے خوفزدہ ہو۔

کوچ مسافروں سے پر ہوئی تو روانہ ہو گئی۔ شوکت نے دو سیٹوں والی ایک سیٹ ڈرائیور کے پیچھے سنبھال لی۔ یہی سٹیشن تک ہوئی تھیں۔ اس نے نظریں سمٹا کر پوری کوچ کا جائزہ لیا۔ شاکی اس کے پھلو میں بیٹھی تھی۔ شاکی نے بس میں سوار ہوتے وقت آصف کو کار سے باہر کھڑے اور شامو اور شانی کو کار کے اندر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز تھی۔ شوکت کو بس میں بہت سے نوجوانوں پر اس اور کوٹ والے، سانپ والے کا شبہ ہوا لیکن دل کسی ایک پر پوری طرح سے جمن نہ سکا۔ جانے یہ ہو جانے وہ ہو۔  
 چھ گھنٹے بعد وہ ہماڑ پر پہنچ گئے۔ وہ کوچ سٹینڈ سے باہر نکلے۔ شوکت کے ہاتھ

آصف کے لمبوں پر بھی دمسی سی انجانی سی سکرابٹ رینگ گئی۔ وہ شاکی کے صوفے کے قریب آ گیا۔  
 ”میں ضرور آؤں گا۔۔۔ اور ہیلو۔“ شوکت جواب دیتے دیتے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 شوکت ریزرویشن کروانے لگا اور شاکی نے آصف کو آہستہ سے سرگوشی کے لیے میں شوکت کے پروگرام سے مطلع کر دیا۔  
 شوکت فون بند کر کے ان کی طرف پلٹا تو وہ اپنا کام ختم کر چکے تھے۔  
 ”میں شام تک لوٹ آؤں گا۔ بزنس کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ پروگرام کس وقت ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”جی۔ دس رات کو۔“ آصف دل میں اس کے خوبصورت جھوٹ پر سکرانے ہوئے اوپ سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ضرور آؤں گا۔“ شوکت صوفے پر بیٹھ گیا۔  
 ”اچھا۔ تو تجھے اجازت دیجئے۔“ آصف واپس مڑا اور اس کی نظریں پھر شاکی سے ٹکرائیں جن میں ایک پیغام تھا۔ اس نے اس پیغام بھت کو پڑھ لیا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا لیکن وہ تو شاکی کو جانتی ہی نہیں تھا اسے یہی کہا گیا تھا۔  
 شوکت نے دو گھنٹے بعد جانے والی کوچ سے دو سٹیشن تک کرائی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملازم اس کا بھاری بھر کم سوٹ بیس لے اندر داخل ہوا۔ شوکت نے کچھ سوچ کر تجربہ کے چند جوڑے شاکی کے لیے سوٹ کیس میں رکھ لیے۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

ابھی بس جانے میں ایک محض باقی قائلین وہ شاکی کو ساتھ لیے ٹیکسی میں کوچ سٹینڈ پر پہنچ گیا۔ کار اس نے اس لیے نہیں لی تھی کہ کار میں ایک تو وہ آ گیا ہوتا اور تھانی سے اسے خوف آنے لگا تھا اور دوسرے اس کی کار کو سنپ والا ابھی طرح پہچانتا تھا پھر شوکت نے کار جیشہ اور تجربہ کے لیے چھوڑ دی۔ بس میں ابھی خاصے لوگ ہوتے اور وہاں وہ سانپ والا۔۔۔ اگر آج بھی جانا تو کوئی حرکت نہ کر سکتا تھا۔

شوکت نے ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ جب بھی اس کے سامنے آیا منہ پر روپال ہاتھ کر آیا تھا۔  
 وہ بے چینی سے کوچ کے پلٹے کا انتظار کرتے لگے۔ شاکی اس کے ساتھ تھی۔



شروع کر دیا۔ ہر طرف سے اطمینان کر کے اس نے یک کو --- دولت سے بھرے ہوئے یک کو کپڑوں کی الماری میں رکھا اور لاگ کر دیا۔ پھر سیلنگ سوٹ پن کر بستر لیٹ گیا۔

بچے ایک خوبصورت نوجوان کاؤتھر پر کھڑی سانولی سی لڑکی سے سید نام کے کسی شخص کی آمد کا پوچھ رہا تھا۔

کچھ دیر کی منتظر کے بعد وہ تیزی سے چلا ہوا ہوٹل سے کافی دور ایک سیاہ رنگ کی شیواریٹ کے قریب پہنچا۔ یہ نوجوان آصف کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ”کیا رہا؟“ اندر بیٹھی ہوئی شانی نے بے تابی سے پوچھا اور آصف نے ان کو مکمل معلومات مہیا کر دیں۔

وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ اچانک شانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے شامو کی طرف دیکھا اور پھر یک کر اس کے کان میں آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔“ شامو نے ساری بات سن کر رضامندی ظاہر کر دی۔ شامو نے آصف سے کچھ کہا۔ وہ مہربان ہوا کوئی بحث کیے بغیر ایک دکان کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ میں دو جتنے لیے ہوئے لوٹ آیا۔ ایک زنانہ اور دوسرا مردانہ۔ خوبصورت سنہرے فریم والے۔ اس نے دونوں جتنے ان کی طرف بڑھا دیے۔ دونوں کے پیشے گمراہ تھے۔ شامو اور شانی نے جتنے آنکھوں پر چڑھا لیے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ ان کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔ شانی کا نسوانی حسن کول کی مانند مکمل گیا تھا اور شامو بہت شاندار لگ رہا تھا۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ جھین آئینز اور شریلی سی مسکراہٹ جس میں فخر کا عنصر نمایاں تھا۔

”چلو آصف۔ اسی ہوٹل میں جہاں وہ گئے ہیں۔“ شامو نے آصف کو نحو حیرت پا کر کہا۔ وہ بھی ان کے حسن کے جادو میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے بغیر کوئی استشار کیے ڈرائیوگ سیٹ بندھال لی۔ انہوں نے اسی منزل پر کہر نمبر ۲۱۶ اور ۲۱۷ حاصل کر لیا۔ یہ آخری دس کمروں میں سے دو کمرے تھے۔ سارے ہوٹل کے کمرے یک ہو چکے تھے۔ کمرے سنگل ہی تھے۔ آخری سوئٹ شوکت اور شانی کے پاس تھا۔ ایک کمرے میں شامو اور شانی اور دوسرے پر آصف نے قبضہ کر لیا۔

میں ایک ہینڈ یک تھا جس میں اس کا تمام روپیہ تھا۔ وہ اپنا تمام کیش ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے اس دن کے واقعے سے خوفزدہ ہو کر روپیہ اپنے ساتھ ہی لیجائے میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ یک کو کاندھے پر ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک مزدور اس کا بھاری بھر کم ایٹنی اٹھائے ہوئے تھا۔ شانی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

شوکت چاروں طرف نظریں سمھاتا ہوا چل رہا تھا۔ اسے کوئی بھی مشتبہ شخصیت نظر نہ آئی اور سب ہی مشکوک بھی لگے۔ اس کا دل شش و پنج میں جھلا تھا۔ خوف نے پھر اسے اپنے جال میں جکڑ لیا تھا۔ شانی کی اور دلچسپی سے خوبصورت دکانوں، ہوٹلوں اور خانوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ہر طرف بھی ہوئی برف اور ہلکی ہلکی ہموار بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ شوکت اپنے پیچھے ہاتھیں دیکھتا ہوا چل رہا تھا لیکن جب اسے کوئی بھی غیر معمولی احساس نہ ہوا تو وہ کچھ مطمئن ہو گیا۔ وہ چلتے چلتے ایک خوبصورت ہوٹل کے پاس پہنچے۔ اس نے نظریں اٹھا کر ہوٹل کی پیشانی پر چپکتے ہوئے الفاظ کو دہرایا۔

”گوئیٹن ہوٹل“

ایک پورٹر تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور مزدور کے ہاتھ سے اٹھنے لیا۔ شوکت نے پرس نکالا اور ہینڈ لوٹوں سے بھرے پرس کے درمیان سے ایک چھوٹا نوٹ کھینچ کر مزدور کی طرف بڑھا دیا۔ مزدور خوش ہو گیا اور سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

وہ پورٹر کے پیچھے ہوٹل کی شاندار عمارت میں داخل ہوئے۔ کاؤتھر پر اس نے ایک سوئٹ بک کیا۔ ”مشرایڈ مزر شوکت“ شوکت نے دیکھا کیے۔

باپ، خاندان --- بی بی

وہ پورٹر کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ بہترین کمرے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ شوکت نے کڑی کھول دی اور باہر دیکھنے لگا۔ ان کا کمرہ چھٹی منزل پر تھا۔ مجھے لوگ بہت چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ کافی بلندی تھی۔ یہاں سے پہاڑوں تک کا منظر بہت صاف اور خوبصورت نظر آتا تھا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر پلا۔ شانی آرام کرنے کا کہہ کر دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور چٹنی چڑھا لی۔ شوکت نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا

شوکت پریشان ہو گیا تھا لیکن سہلی اس کے جذبات کے انتشار کی وجہ نہ جان سکی اور نہ ہی ان دونوں میں سے کوئی یہ دیکھ سکا کہ جب بھی شوکت نے سہلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کی انگلی میں موجود انگوٹھی کا رنگ یکدم سرخ ہو جاتا اور ساتھ ہی شوکت کی حالت غیر ہو جاتی۔

ان کے ہوش میں جانے کے یکدم دیر بعد شامو بھی ہوش میں داخل ہو گیا۔ وہ اسے ہال میں نظر نہ آئے۔ وہ اپنی طرف اٹھی ہوئی حسینوں کی نظروں کا ٹوٹ لے بغیر بیڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شامی اور آصف کو قہقہہ کاروانی کی رپورٹ دے رہا تھا۔ شامی نے ساری بات سن کر اپنے ذہن و دل کو سوچ کے سمندر میں دھکیل دیا۔

شامی کے مخصوص دلوں کی آمد میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے اور شامی اب مزید انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ انہی دلوں میں اپنے انتقام کو آخری شکل دینا چاہتی تھی۔



اگلے دن سہ پرکے قریب شوکت، سہلی کو ساتھ لے کر لے لکھا۔ رات کو پچھلے پھر شامی، شامی وغیرہ سے ملی تھی اور ان کو ہر بات کی رپورٹ دی تھی۔ کوئی اندیشہ کی بات نہیں تھی۔ شوکت نے سہلی کو --- باپ نے اپنی بیٹی کو --- عاشق نے اپنی بیویہ کو شاپک کرائی تھی۔ جب وہ دونوں واپس ہوئے پچھلے تو ایک پورٹل میں سے پچھلے پچھلے کرے میں تین برسے پکٹ لے کر داخل ہوا۔ وہ پکٹ میز پر رکھ کر پلے کر چلا گیا۔ سہلی اپنے کمرے میں چلی گئی اور شوکت سوچ میں پڑ گیا۔ آج بھی اس کے ساتھ وہی ہوا تھا۔ اس نے بہت سوچا لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ کوئی وجہ، کوئی معقول دلیل اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

پھر --- اس نے پکا ارادہ کر لیا۔ --- "آج رات میں اس کھلی کو پھول بنا دوں گا۔" اس نے خود پر قابو پانے کے لیے شراب کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا تاکہ کوئی احساس، کوئی خوف اس پر غلبہ نہ پاسکے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ آرام سے ٹانگیں پھار کر صوفے پر لیٹ گیا۔

سہلی کمرے بدل کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی لیکن شوکت نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ رات کی سیاہی ہر کام کے لیے، خاص طور پر ایسے کاموں کے لیے مناسب ترین مددگار ہوتی ہے۔ اس نے یہ

"تم نے دودھ کے علاوہ کچھ بھی کھایا یا نہیں۔"

"میں ابھی چند روز مزید دودھ کے علاوہ اور کچھ نہیں کھا سکوں گی۔" سہلی نے جواب دیا۔

"کیوں؟" شوکت نے حیرت سے پوچھا۔

"میں دوا کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے صرف دودھ ہی بتایا ہے۔" سہلی نے کہا۔

"دوا --- کس چیز کی دوا۔ میں نے تو تمہیں کوئی دوا کھاتے نہیں دیکھا۔" وہ

نعرہ منہ میں رکھ کر بولا۔

"دوا ختم ہو چکی ہے۔ اب ڈاکٹر نے دودھ اس لیے بتایا ہے کہ جسم میں دوا کی پیداوار کی کوئی قہقہہ دور ہو جائے۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ جانے یہ کیسی دوا ہے جس میں صرف دودھ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔" وہ شامی کے چاکر بولا اور کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

وہ اس وقت ہوش کے ڈانگ ٹانگ ہاں میں ڈنر لے رہے تھے۔ ڈنر کے بعد وہ سہلی کو ساتھ لے کر ہوش سے باہر سیر کے لیے لکھا۔

ان کے باہر نکلنے ہی ایک نوجوان آدمی، اوپر سے بیڑیاں اترتا ہوا تیزی سے باہر نکلا چلا گیا۔ وہ گرم سوٹ میں لبوس تھا۔ اس کا خوبصورت سڈول جسم اور کھانا ہوا رنگ اکثر لڑکیوں کی نگاہوں میں تھننا کر چل گیا۔ اس کا پرکشش چہرہ کئی حسین چروں کی نظروں کا مرکز بنا لیکن وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر سہلی اور شوکت کے پیچھے لکھا چلا گیا۔ کبھی کبھی وہ ادھر ادھر بھی نظریں دو ڈالتا۔ یہ شامو تھا۔

شوکت سہلی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے ذہن کا خوف کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ وہ اس سے پیار بھری باتیں کرتا ہوا چل رہا۔ ایک جگہ اس نے سہلی کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں سکت نہ رہی ہو۔ بے جان ہو گیا ہو۔ اس کا ہاتھ سہلی کی طرف حرکت ہی نہ کر سکا۔ اس نے اسے اپنے خوف کا اثر جانا لیکن تین چار بار اس نے سہلی کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی اور ہر بار اس کی یہی حالت ہوئی۔ اس کے ہاتھوں، بازوؤں وغیرہ میں سے جان ہی نکل جاتی۔ وہ اپنے ہاتھ سے بہت پر پھینچنے پر مجبور ہو گیا۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس نے شرمندگی، غصے اور پریشانی کے لیے جٹا۔

جذبات کے ساتھ سوچا۔ تاہم اب اس نے سہلی کی طرف ہاتھ بڑھانے سے اجازت کیا۔ وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے۔

سوچ کر خود پر قابو پائے رکھا ورنہ سہلی کا کھرا کھرا حسن دیکھتے ہی وہ بے قابو ہو گیا تھا۔

سہلی اس کے سامنے صوفے پر آ بیٹھی۔ وہ موسم، کپڑوں اور بے گئے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔

دوسری طرف شامو، شامی اور آصف اپنے پلان کے ہر پہلو کو سامنے رکھے، ایک بار بھر بحث میں مصروف تھے۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر انہوں نے سہلی کے کمرے میں جانے کا ارادہ کیا مگر آصف نے ان کو مزید انتظار کرنے کو کہا۔

”کیوں؟“ شامی نے حیرت سے پوچھا۔

”اس وقت شوکت اس کے پاس ہو گا۔ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں آئیں ہو گی تب ہم اسے اپنے پلان میں وہیں سے شریک کر لیں گے۔“

تجویزِ مستول حتی اس لیے قبول کر لی گئی۔

☆○☆

رات کے دوسرے پہر وہ بالکل تیار ہو کر سنسان راہداری میں نکل آئے کہ شامو کے جسم میں سنناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس کے قدم رک گئے۔ شامی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ آصف پلان کے مطابق ابھی کمرے میں ہی تھا۔

”شامی۔“ وہ سرسراہٹ ہوئے لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہے شامو؟“

”شامی، شامی خطرے میں ہے اور۔۔۔“ وہ پوری بات کیے بغیر دوڑنے کے انداز میں شوکت کے کمرے کی طرف بھاگا۔

وہ دروازے پر رک گیا۔ شامی بھی اس کے پیچھے کھڑی بے چینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شامو نے اوپر اور دیکھے بغیر ہی کی ہول سے آنکھ لگا دی اور اندر کا منظر دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

شامی صوفے پر بیٹھی تھی اور شوکت شراب کے نشے میں لا کھڑا ہوا دائیں طرف سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شامو نے چہرے پر ہتے ہوئے رومال کو درست کیا اور شامی کی طرف دیکھ کر زور سے دروازے پر دستک دی۔ بھر بھگ کر پھر سوراخ سے اندر دیکھنے لگا۔ شوکت رک گیا تھا۔ شامی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کون ہے؟“ شوکت غصے سے بولا۔

”جی میں ہوں۔ ذرا دروازہ کھولے۔“ شامی نے شامو کے اشارے پر کہا اور شوکت ایک لمبی کی آواز سن کر ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر بوتل کو فرش پر ڈالنے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ شامی تیزی سے بھاگ کر راہداری کے دوسری طرف مڑ گئی۔

شوکت نے جلدی سے دروازہ کھولا اور پچنی پچنی آنکھوں سے نقاب پوش کو دیکھتا ہوا لڑکھارائی کی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم۔۔۔“ اس کے منہ سے اور کچھ نہ نکل سکا اور۔۔۔ نقاب پوش ہاتھ میں کھلا چاقو لیے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

شوکت خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگا کہ اس کا ہی بوتل پر آگیا۔ وہ پھسلا اور فرش پر اٹ گیا۔ شامی کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔ اچانک کھلے ہوئے دروازے سے سانپ رینگتا ہوا اندر داخل ہوا اور شوکت کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

نقاب پوش نے دروازہ بند کر دیا اور شوکت کے چہرے کی زردی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

”تم۔۔۔ آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟“ وہ اپنی پوری قوت جمع کر کے چیخ پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جھک پڑے۔

جواب میں نقاب پوش کا ٹھکانا ہوا اقتبہ گونج اٹھا۔

”بزدل۔“ وہ زہریلے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

اس دوران سانپ شوکت کے قریب پہنچ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ شوکت کا سانس چڑھنے لگا۔ چہرے میں تر ہو گیا اور پگلوں سے کئی قطرے اس کے گالوں پر پھل پڑے۔ شامی بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ نقاب پوش نے شوکت کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لرزتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اب وہ بڑے خوفزدہ انداز میں کبھی نقاب پوش اور کبھی سانپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے موج لٹنے ہی بھاگ نکلے گا۔ نقاب پوش نے کمرے میں اوپر اور نگاہیں دوڑائیں لیکن شاید اسے اپنی مطلوبہ شے نظر نہ آئی۔ وہ شوکت کی طرف مڑا۔

”چاہیان۔“ اس نے ہاتھ پھیلا کر آہستہ سے کہا۔

شوکت جلدی سے اپنے بستری کی طرف بڑھا۔ ”فہمرو۔“ نقاب پوش کی سخت آواز سن کر وہ ٹھک کر رک گیا اور مرکز کاس کی طرف دیکھنے لگا۔

ماچس تمام لی۔ اس کا جسم یوں کاپ رہا تھا جیسے اسے رشتہ ہو گیا ہو۔ اس نے نقاب پوش کا اشارہ باکرہ ماچس کی تیلی نکالی اور ایک بار پھر پر امید نظروں سے نقاب پوش کی طرف دیکھا لیکن اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اسے آگ لگانے کو کہا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے کانپنے لگے۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ دل کٹ کر رہ گیا۔ سارا جسم لرزنے لگا۔ اس نے ماچس پر تیلی کو رگڑا۔ شعلہ سا بھڑکا اور اس نے نقاب پوش کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے غور سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف: پٹنا پاکر اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ اس کے ہاتھ سے تیلی گر پڑی اور فرش پر گر کر بجھ گئی۔ نقاب پوش نے اسے غصہ سے دیکھا اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ اسی لمحے سانپ بھی پھنکارا اس نے جلدی سے دوسری تیلی نکالی اور سانپ کی طرف دیکھتے ہوئے جو "اب اس کی طرف دیکھنا تھا" جلدی سے جلتی تیلی کانپنے لگا۔ انھوں نے نوٹوں کے ڈھیر پر پھینک دی۔ سانپ رک گیا۔

تھوڑی دیر بعد نوٹوں نے آگ پکڑ لی۔ شوکت ایک تک اپنی دولت کو جلنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی ختم ہو رہی تھی۔ آگ کے شعلے لمحہ بہ لمحہ بلند ہو رہے تھے اور شوکت کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ پھر شعلے اپنی حدت اپنا حجم گھٹانے لگے۔ آخر وہاں نوٹوں کی راہ کا ڈھیر رہ گیا۔ شوکت کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اسے فحش آگیا تھا۔ وہ زمین پر لڑکھ گیا۔

نقاب پوش جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ جبکہ کر اسے سیدھا کر کے اس کے دل کی دھڑکن سننے لگا۔ دھڑکن رچ رہی تھی۔ سانس بہت ہلکا ہو گیا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ وہ اطمینان سے سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ابھی زندہ ہے۔" وہ ناگن کی جانب دیکھ کر اہستہ سے بولا۔

شانو نے شامی کو اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیڑھیاں لے کر کے نیچے ہال میں آگئے۔ سارے ہوش میں نہانا تھا۔ ہال کے علاوہ تمام کمروں میں اندھیرا تھا۔ وہ شامی کو ساتھ لیے ہوش کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کاؤنٹر پر ریسپنشن اور باہر دروازے پر دربان بے خبر سے سو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔

"بکرا ہا۔" ایک طرف سے آصف نکل کر ان کے سامنے آگیا۔

"ٹھیک ہے، آؤ۔" اوہ وہ دونوں اندھیرے میں کھڑی کار کی طرف بڑھ گئے۔ کار ہوش کی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔

نقاب پوش اس کی طرف بڑی زہریلی نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے ہسٹری طرف بڑھا اور سائڈ پر کھڑے ہو کر ٹیکہ الٹ دیا اور بڑے مستحضرانہ انداز میں شوکت کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹیکے کے نیچے چھپے چھپائوں کے کھجے کے ساتھ بھرا ہوا پستول پڑا تھا۔ نقاب پوش نے پستول اٹھا کر جب میں ڈال لیا اور چھاپاں ہاتھ میں لے کر ہسٹری پر پہنچا۔ اس نے چاقو سے اشارہ کرتے ہوئے شوکت کو صوفوں کی جانب جانے کو کہا۔ وہ اگلے پاؤں چٹا ہوا صوفوں تک پہنچ گیا اور پھر ایک صوفے پر گر کر ہانپنے لگا۔ اس کی خوفزدہ نظریں سانپ پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے سامنے کندلی مارے بیٹھا پھن لہا رہا تھا۔

نقاب پوش الماری کی طرف بڑھ گیا لیکن الماری پہلے ہی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے الماری کے دونوں پٹ دا کر دیے۔ اسے پچھلے خانے میں اپنی مطلوبہ شے نظر آ گئی۔ اس نے جبکہ کر سیاہ بیگ اٹھایا۔ شوکت ٹھنکی پاندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ترم آئینہ آغار جھلکے لگے۔ نقاب پوش بیگ لے کر شوکت کے قریب آیا اور فرش پر بیٹھے سانپ نے پھنکار ماری۔ شوکت اپنی دولت کو خطرے میں دیکھ کر بے بسی سے ہونٹ کانپنے لگا۔ نقاب پوش نے چابی لگا کر جبکہ کھولا اور بیگ کو فرش پر الٹ دیا۔ فرش پر نوٹوں کی گڈیاں پھیل گئیں۔

شوکت نے خوفزدہ انداز میں ٹھک ہونٹوں پر زبان پھیری اور حلق کو تر کر کے تھوک گل کر رہ گیا۔ فرش پر لاکھوں روپے پڑے تھے۔ نقاب پوش نے ایک نظر سانپ کی طرف دیکھا۔ پھر جب میں ہاتھ ڈالا۔ شوکت کا رہا سار کا بھی فح ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ نقاب پوش اسے شوٹ کرنے جا رہا ہے لیکن جب نقاب پوش کا ہاتھ باہر آیا تو اسے حیرت کے ساتھ ساتھ دل کی دھڑکن بھی رہتی ہوئی محسوس ہوئی۔

نقاب پوش نے ماچس اس کی طرف بڑھا دی اور وہ تقریباً روتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل پھٹ گیا۔ وہ نقاب پوش کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں --- اپنی حاشیوں کے سارے --- اپنی عمر بھر کی کمائی اور اپنے مستقبل کی روشنی کو آگ دکھانا تھی۔

نقاب پوش اس کی دگرگوں حالت سے ذرہ بھر متاثر نہ ہوتے ہوئے ماچس والے ہاتھ کو ہلکا سا جھکا دیا جیسے کہہ رہا ہو۔ "پکڑو۔" اس نے ایک بار پھر بیگ مانگنے والے انداز میں نقاب پوش کی طرف دیکھا لیکن جواب میں نقاب پوش نے سانپ کی طرف دیکھا اور اس کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ شوکت نے کانپنے لگا ہاتھوں سے

شامو دوبارہ ہوش میں چلا گیا۔ آصف اور شاکی کار میں بیٹھ گئے اور شامو جب کمرے میں پہنچا تو شوکت اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سامنے فرش پر ٹانگ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ شامو نے شوکت کے بے ہوش جسم کو اٹھایا اور کانٹے پر ڈال لیا۔ ٹانگ اپنی اصل حالت میں آنے کے لیے پر قول رہی تھی۔ تو ڈی دیر بعد شامو کندھے پر شوکت کو لیے ہوش سے باہر نکلا۔ شاہی، شامو کے ہمراہ تھی۔ وہ باہر نکلے۔ آصف کار سے نکلا اور انہوں نے شوکت کے بے ہوش جسم کو کچھل سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کے پاس شامو بیٹھ گیا اور ساتھ ہی شاہی بھی۔ آصف کار ڈرائیو کرتے لگا۔ شاکی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کار نے پوٹن لیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بھٹکا اٹھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ گولی کی سی تیزی سے سیدھی دوڑتی چلی گئی۔

☆○☆

صبح ہو چکی تھی۔ بجلی بجی دھوپ سفید سفید برف پر عجب سماں پیدا کر رہی تھی۔ سورج کی کریمیں روٹی کے گولوں ایسی سفید برف پر پانچ رہی تھیں۔ وہ سب اس وقت ایک جھونے سے میدان میں موجود تھے۔ چاروں طرف سے اس میدان کو پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا اور دور اوپر ان کی کار کھڑی تھی۔ میدان، پہاڑوں، سڑک، ہر جہت پر برف کی موٹی تہہ جی ہوئی تھی۔ شوکت برف پر پڑا خوفزدہ نظروں سے نقاب پوش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور اس سے کچھ دور برف کے ایک ٹیلے پر آصف اور شاکی بیٹھے اس کو دیکھ رہے تھے۔

”تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ وہ برف پر پڑے بولا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ایک بار سانپ کی طرف بھی دیکھا جو بڑے خوفناک انداز میں پھنکار رہا تھا۔ اس کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے رکا ہوا ہو یا کسی انجانی طاقت نے اسے روک دیا ہو۔

جواب میں نقاب پوش خاموش رہا۔ شوکت باری باری کبھی نقاب پوش اور کبھی سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت لکھ بے لکھ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نقاب پوش سے کئی سوال پوچھ چکا تھا لیکن اسے اپنے ایک سوال کا بھی جواب نہیں ملا تھا۔ بس نقاب پوش اسے گھورتا رہا تھا اور اب شوکت کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا داغ بٹھ جائے گا۔ نقاب پوش کا رویہ اسے پاگل کئے دے رہا تھا۔

آصف اور سلی کو ان کا سامتی دیکر وہ بہت زیادہ حیرت زدہ ہوا تھا لیکن اسے ان سے بھی کئی سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔

وہ صرف سلیپنگ سوٹ میں لباس تھا۔ برف کی ٹھنڈک اس کے خون کو رگوں میں جمید کر رہی تھی۔ اس کے پٹے اکڑ گئے تھے۔ خاص طور پر پشت بالکل سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاب پوش نے فنی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے اقدام کو روک دیا۔ وہ پھر بے بسی سے ہونٹ کاٹتا ہوا ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم مجھ سے چاہتے کیا ہو۔۔۔ کون ہو تم؟“ شوکت چیخ پڑا۔

نقاب پوش نے ایک نظر سانپ کی طرف دیکھا۔ وہ زور سے پھنکار کر پھن لہرا کر رہ گیا۔ تب وہ آہستہ سے شوکت کی طرف پٹا۔

”میں کون ہوں، پہچان سکتے ہو تو پہچان لو۔“ اس نے سر سے قیٹ اتار دیا۔ پھر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے چہرے سے نقاب اتار دی۔

اور۔۔۔ شوکت کا دل اچھل کر حلق میں اٹ گیا۔ وہ ایک تک ایک پرانی محر آشنا۔۔۔ نہ بھولنے والی صورت دیکھ رہا تھا۔

☆○☆

”شامو۔“ اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

”اوہ۔۔۔ ابھی تک یاد ہے!“ شامو طرہ انداز میں بولا۔

”اگر شامو موجود ہے تو شاکی کو بھی یہیں کہیں ہونا چاہئے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر۔۔۔ اس کی نظریں شاکی پر جم گئیں۔ اس کے نقوش میں اسے شاہی کے چہرے کی بجلی کی جھلک نظر آئی۔

لیکن نہیں۔۔۔ یہ شاہی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس سے کافی کم عمر ہے۔ اس نے اپنے خیال کی خودی تزیید کر دی۔

”پاپو۔“ وہ چونک کر شامو کی طرف دیکھنے لگا جو اسے بڑی زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تھوک نگل کر رہ گیا۔

”جیسے تم ڈھونڈ رہے ہو وہ جی نہیں موجود ہے۔ تمہارے پاس۔۔۔“ شامو کی آواز میں نرمی کا کوئی عنصر نہ تھا۔

”کھاں!“ وہ گردن موڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن دور دور تک اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔  
سفید برف پھیلی ہوئی تھی اور بس۔۔۔ وہ پھر شامو کی طرف دیکھنے لگا۔ جو طنز انداز میں مسکرا رہا تھا۔  
”نہیں دکھائی دی۔“ وہ آہستہ سے بولا اور شوکت کی پیشانی پر پسینے کی قطرے نمودار ہو گئے۔  
”شامی! تمہارے سامنے ہی تو بیٹھی ہے۔ تمہارے پاس۔۔۔“  
”کیا؟“ وہ حیرت اور خوف کے لئے جلع جذبات سے اچھل کر رہ گیا۔ اس کے سامنے تو۔۔۔ سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ چپہ کے بل خوفزدہ انداز میں پیچھے کھٹکنے لگا۔  
”تو کیا؟“ وہ لرز کر رہ گیا۔

”ہاں بابو۔۔۔ ابھی تو یہ اس کا ایک روپ ہے۔“ شامو ہنس پڑا۔  
”ایک ناگن کے جسم میں زوردار حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اچھلی اور شوکت پر آ رہی۔ شوکت کے حلق سے ایک خوفزدہ چیخ ابھری۔ وہ اٹھ کر بھاگنے لگا لیکن ناگن اس کے جسم سے اڑ کر اس کے سامنے آ رہی۔ شوکت رک گیا۔ وہ خوفزدہ انداز میں دوسری طرف بھاگا لیکن ناگن اچھل کر اسی طرف آ گئی۔ وہ جس طرف جاتا ناگن اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ پھر وہ پیچھے جتا جتا شامو کے قدموں پر آگرا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ شامو۔۔۔ سینے پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔  
”شامو۔۔۔ مجھے بچا لو۔ مجھے بچا لو شامو۔ میں نہیں۔۔۔ میں نہیں بہت

دولت دوں گا۔ ساری دولت دے دوں گا۔ مجھے بچا لو۔“  
شامو کے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جواب میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔۔۔ وہ فلّا بایاں کھانا ہوا برف پر الٹ گیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور اگلے دو دانت ٹوٹ کر حلق میں جا پڑے۔ سفید سفید برف پر ”سرخ سرخ“ غن پھیل گیا تھا۔ شوکت نے اپنے اگلے ہاتھ سے خون صاف کیا اور دہشت زدہ نظروں سے اپنے سامنے کنڈلی مارے بیٹھی ناگن کو دیکھنے لگا۔ پھر۔۔۔ ناگن آہستہ آہستہ زمین سے بلند ہونے لگی۔ پھر وہ دم کے بل زمین پر کھڑی ہو گئی۔ ایک زوردار پھٹکار گونجی اور شوکت خوف سے لرز کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھٹکار سے

ایک خوفناک آواز اسے صاف سنائی دی تھی۔ ایک لمبے کے لیے۔۔۔ اس کی نظروں کے سامنے وہندی آگئی اور وہ حیرت سے پٹنی آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے ”زندہ“ قزوغب کی صورت۔۔۔ شامی کھڑی تھی۔  
”شامی۔“ وہ دہشت کھا گیا اور برف کے فرش پر لڑکھ گیا۔  
”بابو۔“ تو ابھی نہیں مر سکا۔ تو جی نہیں مرنے کا بابو۔“ شامی نفرت سے دانت بچھ کر غرائی۔

اس نے شامو کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور شوکت کو بالوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اس نے اس کے بالوں کو تین چار بار زوردار جھٹکے دیے اور شوکت کراہتا ہوا ہوش میں آ گیا۔

اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ محنتوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ شامو ایک طرف ہو کر پھر لاپرواہی سے کھڑا ہو گیا۔ شامی اسے زہریلی نظروں سے گھور رہی تھی۔  
”بابو۔ میں اپنا وعدہ پورا کرنے آگئی ہوں۔“ وہ غوغار لیجے میں بولی۔  
”شامی۔“ ایک لمبے کے لیے شوکت کی نظروں میں ماضی کسی قلم کی طرح لہرا گیا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

”مجھے معاف کر دو شامی۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا اور شامی کے حلق سے ایک بلند آہنگ قہقہہ ابل پڑا۔  
”معاف کر دوں۔“ اس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اس نے آنکھیں صاف کیں اور دیوانوں کی طرح جپتے ہوئے اس نے شوکت کی طرف دیکھا۔

”شامی۔ مجھے جان سے مت مارو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو شامی۔“ وہ آگے بڑھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔  
ایک لمبے کے لیے شامی ڈنگا گئی۔ مگر دوسرے ہی لمبے اس کے دل و دماغ سے ہر قسم کے رحم کے جذبات مٹ گئے۔ انتقام کے جذبے نے ہر احساس کو دبا دیا اور شوکت زمین پر لڑکھ گیا۔ شامی کی ٹھوکر کچھ ایسی ہی زوردار تھی۔

”نہیں۔“ وہ چیخ پڑا۔ ”مجھے جان سے مت مارو۔ مجھے جان سے مت مارو۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر چٹپٹا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گی لیکن اپنا انتقام ضرور لوں

نے شاکی کی طرف دیکھا۔

”اوه ہاں بالو۔۔۔۔۔“ شاکی کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ ”میں تو بھول ہی گئی تھی۔  
ادھر آ آشاکی۔۔۔۔۔“ اس نے شاکی کو بلایا اور وہ اٹھ کر اس کی طرف آگئی۔ آصف  
دیر ان نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

”شاکی۔۔۔۔۔ تو سل۔۔۔۔۔“ شوکت ہلکایا۔

”ہاں بالو۔۔۔۔۔ یہ سلی ہے لیکن حقیقت میں شاکی ہے اور جانتا ہے یہ کون ہے؟“  
وہ عمارت سے بولی۔

”ک۔۔۔۔۔ کون ہے؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ تیری بیٹی ہے۔۔۔۔۔“ وہ گرجی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ جی پڑا۔

”ہاں بالو ہاں۔۔۔۔۔ میرے بیٹے میں جو تیرا چچا تھا۔ وہ شاکی کے روپ میں تیرے  
سامنے ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ دو سال میں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بات ضرور تجھے بے یقینی میں جلا کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں تجھے  
اس کا ثبوت دوں گی۔“ وہ ہونٹ پیچھ کر بولی۔

اسی وقت آسمان پر چمکا ہوا سورج بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ ہر طرف ایک  
راسراری فضا قائم ہو گئی۔ بادل گھر آئے۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی بارش ہونے لگے  
تھی۔ بادل گر رہے تھے۔ بجلی چمکنے لگی۔ ہوا رک گئی۔۔۔۔۔ اور فضا میں پراسراریت  
بڑھنے لگی۔

شاکی نظریں اٹھا چند لمے تک آسمان کو دیکھتی رہی۔ شاکی اور شامو بھی ادھر  
دیکھ رہے تھے۔ شوکت ان کو دیکھ رہا تھا۔

پھر۔۔۔۔۔ ان کے چروں پر جوش کے آثار پھیل گئے۔

”دوتا۔۔۔۔۔ ان کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔۔۔۔۔ اسی وقت بادل  
زور سے گر رہے۔ بجلی اورد زور سے چکی اور فضا میں ایک لہرائے ہوئے سانپ کی

شبیبہ بنتی چلی گئی۔ دوسرے ہی لمے شبیبہ مٹ گئی۔

شوکت بہت بین کر رہ گیا۔ آصف اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ دوسری اور تیسری  
مرتبہ پھر بادل پوری طاقت سے گر رہے اور بجلی فضا میں ایک بہت بڑے لہرائے

ہوئے سانپ کی شبیبہ بناتی چلی گئی۔ وہ تینوں سجدے میں گر گئے۔ شوکت، بالکل

گی۔ اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گی۔“ شاکی گردن تان کر بولی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ پھر چنچا۔

شاکی اس کی طرف بڑھی۔ ”بالو۔۔۔۔۔ میں نے تیری خواہش کا احترام کیا ہے۔  
تجھے بھی میری آگ کو لمسٹا کرنے میں مدد کرنی چاہئے۔“

”میں تیرا شوہر ہوں شاکی۔“ وہ روٹے ہوئے بولا۔

”شوہر۔۔۔۔۔ اس نے عمارت سے زمین پر تھوک دیا۔ ”نہیں بالو۔۔۔۔۔ تو مجھے اپنی  
بیوی ہونے کے حق سے محروم کر چکا ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر زہریلے لہجے میں

بولی۔

”شاکی۔۔۔۔۔ وہ گڑ گرایا۔

”ہاں بالو۔۔۔۔۔ میرے بیٹے میں تیرا چچا تھا۔ لیکن تو نے مجھے ٹھوکریں ماریں اور  
گھر سے نکال دیا۔ یاد کر بالو۔۔۔۔۔ تو نے مجھے اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ تو

نے میرے سامنے مجھے دکھ تکلیف، غم دینے کے لیے میرا دل جلائے کے لیے۔۔۔۔۔  
اپنی عیاشیوں کی خاطر۔۔۔۔۔ لڑکیوں سے رنگ رلیاں مٹائیں۔ میں خاموش رہی۔“

وہ گرجے لگی۔

”تو مجھے ہر روز پینتا تھا۔ میں نے اف نہ کی۔ تو مجھ سے نوکوں سے بدتر  
سلوک کرنا رہا“ میں سستی رہی۔ تو مجھ پر ظلم کرنا رہا۔ میں تیری راہوں میں آنکھیں

بجاتی رہی۔ تو نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں ساری رات سردی میں اُکڑتی رہی۔  
تجھے پکارتی رہی۔ تجھے رحم نہ آیا۔ میں تیرے پاؤں پر گر کر تجھ سے معافیاں مانجی

رہی۔ تو نے مجھے ٹھوکوں پر رکھ لیا۔ تو دوسری لڑکیوں کے سامنے مجھے ذلیل کرنا  
رہا۔ مارتا رہا۔ میں چپ رہی اور پھر۔۔۔۔۔ تو نے مجھے گھر سے نکال دینے کے ساتھ

ہی اپنی بیوی ماننے سے بھی انکار کر دیا اور تب۔۔۔۔۔ میں نے کماحقہ تجھ سے انتقام  
ضرور لوں گی اور تو۔۔۔۔۔ عمارت سے ہنس دیا تھا۔ بتا بالو۔۔۔۔۔ میں تجھے کیسے معاف کر

دوں؟“ وہ جی پڑی۔

”شاکی۔۔۔۔۔ رحم کر۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑ گرایا۔

”رحم اور تجھ پر۔۔۔۔۔ وہ نفرت سے بولی۔ ”میں تجھ سے وعدہ کر چکی ہوں بالو“  
تجھے جان سے نہیں ماؤں گی۔ پھر تو کیوں گھبراتا ہے۔ مجھے بھی تو اپنے ارمان نکال

لینے دے۔“ وہ آگے بڑھی۔

”شاکی۔۔۔۔۔ اور شاکی رک گئی۔ اس نے مڑ کر شامو کی طرف دیکھا اور شامو

"لے باؤ۔ دیکھ لے" یہ تیری بیٹی ہے۔ اب تو تجھے یقین آ گیا ہے کہ یہ سب دیوتا کا کرشمہ تھا۔"

"میری بیٹی۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور سر اٹھا کر بیٹی کو دیکھنے لگا۔

"لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ میری بیٹی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔  
 "باؤ۔" وہ چیخ پڑی۔ اس کا چہرہ لال سمجھو کا ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چمک آئے۔ شوکت نے براہ راست اس کی عزت پر حملہ کیا تھا۔

"تو۔۔۔ تو کتنا ہے باؤ۔۔۔ ذلیل ہے۔۔۔ کیسہ ہے۔" وہ اس پر تھوکتی ہوئی بولی۔

"یہ تیری بیٹی ہے باؤ۔۔۔ جس سے تو آج تک دست درازی کرتا رہا۔ اسے اپنی محبوبہ بنانا باؤ۔" وہ نفرت سے بولی۔

اس کا غصہ بڑھتا رہا اور شوکت کے رہے سے اوسمان بھی خطا ہو گئے۔  
 "شامی۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خوفزدگی کے عالم میں تھوکت لگ کر رہ گیا۔

"باؤ۔ تو نے اس بات کا ثبوت مانگا ہے کہ یہ بیٹی تیری ہے۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تو۔۔۔ بے غیرت۔۔۔ اسے پہچان نہ سکا۔ تیرے خون نے اسے دیکھ کر جوش نہ مارا۔ تو اسے بری نیت سے دیکھتا رہا۔ برے ارادے سے اس کی طرف بوستا رہا لیکن تو ایک بار بھی نہ کانپا۔ ایک بار بھی تیرے دل میں ٹپ پیدا نہ ہوئی۔ بے غیرت ہے ناں۔ اور بے غیرت کبھی اپنے پرانے کی پہچان نہیں کر سکتا اور اب۔۔۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔۔۔ دیوتا۔۔۔ اجازت دے۔۔۔ مجھے اجازت دے دیوتا۔" وہ پلٹ کر دیوتا کی طرف رخ کر کے بولی۔

"اجازت ہے میری بیٹی۔" دیوتا کی قہر خیز آواز آئی۔

"دیوتا۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اسے جان سے نہیں ماروں گی۔" "ٹھیک ہے شامی۔ یہ مرے کا نہیں لیکن زندوں میں بھی نہیں رہے گا۔" دیوتا نے کہا۔

شوکت نے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر شامی کھڑی اسے قہر نود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے شامی کو پھر اسی جگہ ڈال دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ دیوتا کی کڑکٹی ہوئی برائی لہر آئی اور شامی پھر اپنے اصل روپ

ساکت ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ آصف کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایک لخت فضا میں بدروحوں کی سی چٹھیں گونج اٹھیں۔ فضا میں بار بار دیوتا کی شبیہ بننے اور مٹنے لگی۔ بدروحوں کی چٹختی آوازوں میں تیزی آتی چلی گئی۔ وہ کدے میں پڑے رہے ایک بار پھر بادل پوری قوت سے گڑگڑائے۔ بجلی چمکی۔۔۔ اور فضا میں خاموشی چھا گئی۔ جیسے جنم کا درد بند ہو گیا ہو۔ شوکت کو سکتہ ہو گیا تھا۔۔۔ کبھی فضا ایک خوفناک، قہر خیز آواز اور عجیب سی آواز سے گونج اٹھی۔

"شامی، شامو، شامی۔۔۔ میرے بیماری۔"

"دیوتا۔" وہ تینوں سر اٹھا کر بولے اور ان کی نظریں سامنے جم گئیں۔ دیوتا کی لہرائی ہوئی شبیہ بجلی کی چمک میں، فضا میں موجود تھی۔ وہ سر جھکا کر دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

"میرے بچے۔" دیوتا کی آواز آئی۔

"دیوتا۔" ان کی آوازیں اُنسی ابھری تھیں۔

"وقت آ گیا ہے شامی۔"

"حکم دیوتا۔"

"پہلے اس درندے کو اس کی بیٹی دکھا دے شامی۔" دیوتا کی غضب ناک آواز آئی۔

"دیوتا۔" شامی سر اٹھا کر بولی۔۔۔ ادھر شوکت کو بھی ہوش آ گیا۔

اسے سامنے پہنچتی ہوئی دیوتا کی شبیہ صاف لہرائی نظر آ رہی تھی اور آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ پھر خوفزدہ ہو گیا۔ اس کی گھٹکی بندھ گئی۔

"شامی۔"

"دیوتا۔"

"شامی کو آگے بھیج دے۔" اور شامی نے شامی کو آگے دھکیل دیا۔

دوسرے ہی لمحے دیوتا کی شبیہ سے زوردار روشن لہر خارج ہوئی اور اڑتی ہوئی شامی پر آ پڑی۔

سب کی آنکھیں ترہو ہو گئیں۔ بند ہو گئیں اور جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو شامی کی جگہ دو سال کی بچی برف پر پڑی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ شامی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور شوکت کے پاس لے آئی۔



میں آگئی۔ اب وہ پھر اٹھارہ سال کی البرود شیرہ تھی۔ شوکت خوفزدہ نظروں سے یہ سن بچہ دیکھ رہا تھا۔

”شاگی۔“ شاگی کی آواز آئی۔ اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کی قریب آ گئی۔

”اے جانی ہو، یہ کون ہے؟“

”یہ شوکت ہے جو میری عزت کے درپے تھا۔“ وہ نظریں جھکا کر نفرت سے بولی۔

”نہیں شاگی۔ یہ تیرا باپ ہے۔“

”کیا؟“ شاگی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”ہاں شاگی۔ یہ تیرا باپ ہے۔ باپ اپنی بیٹی کی عصمت لوٹنا چاہتا تھا۔“ شاگی تشدد لگا کر بولی۔

”نہیں۔ یہ میرا باپ نہیں ہو سکتا۔ یہ شرابی، عیاش، یہ۔۔۔۔۔۔“ وہ منہ چھپا کر بھائی ہوئی شامو کے پاس چلی گئی۔ اس نے اسے سینہ سے لگا لیا اور شاگی بچکیاں لے کر رونے لگی۔ شامو کی پلکیں بھی نم ہو گئیں۔

”اب کیا رہے شاگی؟“ پوچھنا کی آواز آئی۔

”جو حکم دیو نا۔“ شاگی نے کہا اور قدم قدم شوکت کی طرف بڑھنے لگی۔ شوکت ڈھائی انداز میں ”نہیں نہیں“ چیتا ہوجھنے لگا۔

شاگی برف کے فرش پر دوڑا نو بیٹھ گئی۔ اس نے ایک زور دار نعرہ لگایا۔ ”شوگاما۔“ اور دوسرے ہی لمحے وہ وہ ناگن کے روپ میں صلعنا شروع ہو گئی۔

”نہیں۔“ شوکت چیتا ہوا بھاگ نکلا لیکن۔۔۔۔۔۔ شاگی۔۔۔۔۔۔ ناگن۔۔۔۔۔۔ اس کی تیز رفتاری کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے آگے موجود تھی۔ شوکت بھاگ کر جس طرف جاتا ناگن کو اپنے سامنے پاتا۔ پھر وہ برف کے ایک قودے سے ٹکرا کر گر پڑا۔ ناگن بھی پھن اٹھائے اس کی طرف بڑھی۔ شوکت

موت کے خوف سے پاگل ہو رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ دونوں آنکھوں پر ہاتھ کر رکھ پوری قوت سے چیتا اور اسی وقت ناگن اڑتی ہوئی اس پر آری۔ ایک تیز چو شوکت کے قلع سے آزاد ہوئی۔

ناگن نے اس کے ماتھے پر ڈس لیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیشانی تھامے

ہوئے دم سے زمین پر آ رہا۔ اب اس کے قلع سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔ اس کا جسم ایک بار سختی انداز میں اڑ گیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ زمین سے کئی کئی فٹ اوپر اچھل رہا تھا۔ اس کے ناگ اور منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ تڑپا رہا۔ بے آواز چیتا رہا اور پھر شاگی اور شامو نے وہاں ایک عجیب انگشت شے کو دیکھا۔

شوکت کی جگہ اب وہاں ایک کمرہ شے موجود تھی۔ انسانوں ہی کی طرح کے دو ہاتھ دو اور دو پاؤں تھے۔ دو بازو، دو ٹانگیں، ایک ٹاک، ایک سر، دو کان لیکن وہ انسان تو کیا جانور بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کا سارا جسم پھول گیا تھا۔ رحمت سیانی مائل زرد ہو گئی تھی۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں بڑے بڑے آبلے نہ ہوں اور

ان سے سیاہی مائل کی پتہ بہ رہی تھی۔ آنکھوں کا رنگ زرد تھا۔ سر کے بال بڑے بڑے پھوڑوں میں چھپ گئے تھے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور موٹے موٹے ہونٹوں سے آدھ فٹ لمبی۔۔۔۔۔۔ سرخ سرخ زبان باہر لگی رہی تھی جس پر سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بے شمار کیڑے رنگ رہے تھے۔

وہ ہانپ رہا تھا جیسے کتا اپتا ہے۔ اس کی زبان اور جسم سے نکلتا ہوا گند امواہ سفید برف پر عجیب و غریب نقش و نگار بنا رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر خوف کے مارے گھمگی بڑھ جاتی تھی۔

شاگی نے شامو کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ وہ اس خوفناک منظر کو دیکھ نہ سکتی تھی۔ ایک آصف ہی تھا جو بالکل خاموش، دیران نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ شاگی کے معنططسی اثر میں تھا اور شاگی۔۔۔۔۔۔ انسانی روپ میں آکر شوکت۔۔۔۔۔۔ دولت مند شوکت۔۔۔۔۔۔ لڑکیوں کے شکاری شوکت۔۔۔۔۔۔ خوبصورت شوکت کو دیکھ رہی تھی اور جھٹکے لگا رہی تھی۔

”ہا۔۔۔۔۔۔ میں ہوں شاگی اور یہ ہے جنگلی شاگی کا انتقام۔“ وہ پھر جھٹکے لگانے لگی۔

شوکت۔۔۔۔۔۔ جسے اب انسان کہنا غلط تھا۔۔۔۔۔۔ برف کے فرش پر چوٹی سے بھی ہلکی رفتاری میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ کئی فٹ نیچے گرے میں گر پڑا اور

ایک عجیب سی کڑا اس کے منہ سے خارج ہو گئی۔ جیسے کوئی بھجڑا رویا ہو۔

”ہا۔۔۔۔۔۔“ وہ ہونٹ بھیج کر زہرے لیے بچے میں بولی۔ ”تو سب کچھ دیکھے گا۔۔۔۔۔۔ سب کچھ سمجھے گا۔“

بکھ بنے گا لیکن خود۔۔۔۔۔۔ خود تو کتے سے بھی بدتر

”شامی۔“ دیو تانے پکارا اور شامی اور شامو چونک پڑے۔ شامو کے دل میں خوشیوں کے گلشن کھل اٹھے تھے۔ وہ جھوم کر رہ گیا تھا۔ دیو ناکی آواز پر شامی آگے آئی اور جھک گئی۔

”شامی۔“ آخری بار ماں سے مل لو۔ اس کے بعد تم اسے کبھی اس صورت میں نہ دیکھ سکو گی۔“

”ماں۔“

”میری بیٹی۔“

دو دھچکیں۔۔۔ دو درو بھری آوازیں ابھریں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ پوری طاقت سے ایک دوسری کو بھینچ لیں۔ ان کی آنکھیں برس پڑیں۔ شامی نے روٹی ہوئی شامی کو بے تحاشا پیار کیا۔ وہ اس کے بالوں، پیشانی، آنکھوں، ہونٹوں، گالوں اور ہر جگہ پر مہر محبت ثبت کر رہی تھی اور شامی ماں کو چوم چوم کر اپنی پیاس بجھا رہی۔ بہت دیر گزر گئی۔ شامو کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ پھر شامی نے ہمت کر کے شامی کو اپنے سے الگ کیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”بیٹی“ وہ کانپتے ہوئے لیے بیٹھ بیوی۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں ایک سیلاب امنڈا چلا آ رہا تھا۔ ”بیٹی۔“ فکر مت کر۔ تو جب ہی چاہے مجھے بابا کے پاس آ کر مل جایا کرتا۔ شامی نے اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔

”آؤ۔“ شامی اس کا ہاتھ تھام کر دیو ناکی طرف پلٹی۔

پھر۔۔۔ دیو تانے حکم دے دیا۔

شامی کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔۔۔ دیو تا کا حکم تھا اور اسے اس کی قیبل کرنا تھی۔

شامی نے آنکھیں بند کر کے چہرہ شامی کے آگے کر دیا۔ شامی نے ایک نظر دیو ناکی شبیہ کو دیکھا۔ پھر وہ شامی کے چہرے پر بھینکی چلی گئی۔

اس نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ شامی کی زبان شامی کے منہ میں داخل ہو گئی۔ شامی اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اس کی زبان کو چوسنے لگی۔ شامی بے حس حرکت کھڑی تھی اور شامی اس کے جسم کا زہر۔۔۔ اس کا ناگن روپ اپنے جسم میں سوسے لئے جاری تھی۔ وہ چوستی رہی۔۔۔ چوستی رہی اور مواد اپنے طلق سے نیچے آتا رہی۔

زندگی گزارے گا۔ کوئی تجھ پر تھو کہ مجھی نہیں۔“

☆○☆

”شامی۔“ دیو ناکی آواز سن کر شامی یکدم خاموش ہو گئی۔ وہ دیو تا کے سامنے جھک گئی۔

”شامی۔ اب تمہیں اپنا آخری فرض بھی پورا کرنا ہے۔“

”حکم دیو تا۔“

”میں نے تجھے بتایا تھا ماں کہ تمہیں ایک قربانی دینی پڑے گی۔“

”مجھے یاد ہے دیو تا۔“

”تو سن۔ یہ اسی قربانی کا وقت ہے۔ تو نے شامی کی شادی آصف سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ہاں دیو تا۔“

”لیکن ان کی شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک شامی مکمل طور پر انسانی صلاحیتوں کی مالک نہ بن جائے۔ ورنہ ان دونوں کی موت یقینی ہے۔“

”دیو تا۔“ وہ ترپ گئی۔

”ہاں شامی۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا ہو گا۔ میں اپنی شامی کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔“

”نہیں شامی۔ تجھے جان دینے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر؟“

”شامی کو ہمیشہ کے لیے انسان بنانے کے لیے“ اسے مکمل انسانی شکل دینے کے لیے۔۔۔ جس میں وہ کسی قسم کی غیر انسانی یعنی ناگن کی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوگی“

بلکہ ایک عام لڑکی ہوگی۔۔۔ تجھے ہمیشہ کے لیے انسانی روپ چھوڑ کر ناگن بن جانا ہو گا۔“

اور۔۔۔ شامی کا سارا جسم کانپ کر رہ گیا۔ ”ہمیشہ کے لیے۔۔۔“ اس نے سوچا ”تو پھر شامو۔۔۔ کیا بھی اس کا نہ بن سکے گا؟“

”نہیں شامی۔ شامو تیرا تھا۔ تیرا رہے گا۔ وہ تیرا اور تو اس کی ضرورت ہے گی۔ ہم اسے بھی ناگ بنا دیں گے۔“

اور شامی کے لیے ہر طرف بھاری بھاری بھیل گئی۔

”مجھے کیا کرنا ہے دیو تا۔ میں تیار ہوں۔“ وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

پھر۔۔۔ ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔

شامی کے پاؤں پر سانپ کی کینچلی سمجھ گئی۔ وہ اب بھی شامی کی زبان چوس رہی تھی۔

شامی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے شامی کی زبان اس کے پورے جسم میں پھر رہی ہو۔ ایک ایک رگ میں سرایت کر گئی ہو۔ شامی، شامی کی زبان چوستی رہی اور اس کے جسم پر سانپ کی کینچلی آہستہ آہستہ بوتی چلی گئی۔ پاؤں سے گتھوں پر، پھر رانوں پر، سینے پر اور اب اس کے بازو شامی کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ اب صرف اس کا چہرہ رہ گیا تھا۔ شامی بے ہوش ہوئے کے قریب تھی۔۔۔ پھر۔۔۔ شامی کے چہرے پر بھی سانپ کی کینچلی سمجھ گئی۔ اب شامی کے ہونٹوں پر ایک ناگن اپنا منہ رکھے ہوئے تھی۔۔۔ وہ مکمل ناگن بن چکی تھی اور شامی۔۔۔ وہ مکمل انسانی روپ اختیار کر چکی تھی۔

ناگن نے شامی کے منہ سے اپنا منہ ہٹالیا۔ اس کے منہ ہٹانے ہی شامی دھڑام سے زمین پر آری لیکن فرش برف کا تھا اس لیے اسے کوئی چوٹ نہ آئی۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ ناگن کنڈلی مارے اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور دُور سے پتھکاری۔

”دو تا۔۔۔ اور۔۔۔ دو تا کی تھر تھرائی آواز پر اسرار فضا کے سکوت کو توڑتی چلی گئی۔

”شامی۔ تو نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ شامی۔“ اور دو تا کی آواز سننے ہی شامی نے کراہ کر آنکھیں مکول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے قریب ناگن کو دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئی۔

اس نے ناگن کو اٹھا کر سینے سے لگا کر سمجھ لیا۔ ”ماں“ تو عقیم ہے ماں۔“ وہ روتی ہوئی بولی۔

وہ انہی اور ناگن کو سینے سے لگائے اس طرف چلی جہاں شوکت کا قافلِ نفرت وجود پڑا تھا۔

”بابو۔ دیکھ۔ میری ماں کتنی عقیم ہے۔ اس نے میری خاطر خود کو مار ڈالا۔۔۔“ وہ نفرت سے چیختی اور شوکت کا وجود جو گھٹن ہوا اور چڑھ آیا تھا پھر کسی بھیڑیے کی طرح رو کر کرا بنے لگا۔ وہ بچلی اور اس نے شوکت پر تھوک دیا۔ باب پر تھوک دیا اور۔۔۔ شوکت کی زرد آنکھوں سے سیاہ آنسو نکل کر اس کے

رخساروں پر موجود چھوڑوں میں جذب ہو گئے۔ اس نے اپنا بڑا سا سر زمین پر دے مارا۔ اس کا پھار سا بدن یوں ہلنے لگا جیسے وہ پھیلانے لے کر رو رہا ہو۔ سسک رہا ہو لیکن کسی کو اس پر ترس نہ آیا۔

دیوانے کے حکم پر شامی نے ناگن کو زمین پر ڈال دیا۔

”شامو۔“ دیوانے کی آواز پر شامو جلدی سے جھک گیا۔

”تو بھی آخری بار شامی سے مل لے۔ پھر ہم تجھے تیری شامی کے پاس لے چلیں۔“

شامو آہستہ سے سیدھا ہو گیا۔ اس نے ہولے سے پلٹ کر شامی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے شامی کو بچی کی طرح پالا تھا۔ اور آج۔۔۔ وہ اس سے آخری بار اس روپ میں مل رہا تھا۔ اس نے دونوں بازو پھیلا دیے۔ شامی دوڑ کر اس سے پلٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے الٹک رواں ہو گئے۔

”میری بیٹی۔“ شامو کی زبان کہتے کہتے نہ تھکتی تھی اور شامی بچا۔۔۔ بچا پکارتی ہوئی اس سے ہلپی جا رہی تھی۔

”مت رو بیٹی۔ مت رو۔ میں شامی کے ساتھ بابا کے پاس تیرا انتظار کیا کروں گا۔ آئے گی ناں۔“ اس نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

اور شامی ”بچا“ کہتے ہوئے اس سے بچوں کی طرح چٹ گئی۔ شامو نے اسے پوری قوت سے سمجھ لیا اور اس کے سیاہ بالوں پر منہ رکھ کر بچوں کی طرح ہلکنے لگا۔ وہ بچوں کی طرح روتے رہے اور زمین پر بیٹھی ہوئی ناگن نبھانے کیوں بل کھانے لگی۔ شامو ابھی تڑپ رہی تھی۔

پھر۔۔۔ شامو نے اسے خود سے الگ کیا اور اس کی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ اسے پشیمانی پر آخری بار پکارا۔ پھر وہ الگ ہو گئے۔

”یہ میری نشانی سمجھ کر بیٹھ پاس رکھنا۔“ شامو نے شامی کی انگلی میں موجود اپنی انگوٹھی کو چھو کر کہا۔ اور شامی نے انگوٹھی کو چوم لیا۔ وہ ایک بار پھر پلٹ گئے۔ پھر بیٹھی چکوں کے ساتھ جدا ہوئے۔

”شامو۔“

”دیوانے۔“ وہ آنکھیں پونچھ کر بولا۔

”تو نے بت اچھا کیا شامو۔ شامی۔ ہمیں معلوم ہے تو کیا سوچ رہی ہے۔ انگوٹھی کو زبان سے چاٹ لے۔“

ناگن نے زبان نکال کر ہونٹوں پر پھیری اور اپنا پہن لہرائے گی۔

”آصف۔“ دیوتا نے براہ راست آصف کو مخاطب کیا۔ وہ ویران ویران آنکھوں سے دیوتا کی شبیہ کو دیکھنے لگا۔

”ہم جا رہے ہیں۔ آج سے شامی تیری شریک زندگی ہے۔ تیری بیوی ہے۔ تو ساری زندگی اس سے وفا کرے گا اور شامی تو بھی اس سے وفا کا وعدہ پورا کرے گی۔ تم دونوں ایک دوسرے کے بن کر رہو گے۔ آصف تو شہر جا کر شامی سے شادی کر لے گا۔ ابھی وہ تیری مغیتر ہے۔ تجھے کچھ یاد نہیں رہے گا۔ تو سب کچھ بھول جائے گا۔ یاد رہے گا تو صرف یہ کہ شامی۔۔۔ سردار شانان کی نواسی ہے۔ تو شامی کو اس سے مانگ کر اپنی بیوی بنا کر لیا ہے۔ یہاں تم دونوں میرے لیے آئے ہو۔ شوکت کے بارے میں تجھیں کچھ یاد نہیں رہے گا کہ وہ کون تھا اور کہاں ہے؟ جب بھی شامی خواہش کرے گی تو اسے سردار شانان کے پاس ملانے کے لیے لیجائے گا۔ تو ہوش کی فوری چوڑو لے گا۔ تیرے گھر میں دولت کا ایک ڈبیر تیرا خضر ہے۔ تو کوئی اچھا سا کردار کرے گا۔ تجھے شامی، شامو کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہے گا۔ اب وہ ناگ اور ناگن ہیں۔ آصف۔۔۔ تو اب ہوش میں آ جائے گا۔ تجھے ان باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہے گا جو ہم نے تجھ سے کہی ہیں۔“

دیوتا خاموش ہو گیا اور آصف چونک پڑا۔

اس نے چونک کر آسمان پر گھرے بادلوں کو دیکھا اور پاس کھڑی شامی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بادل گرنے اور بجلی گھٹنے لگی تھی۔

”آؤ شامی چلیں۔ بادل گھر آئے ہیں۔ بارش آگئی تو مشکل ہو جائے گی۔“

اور شامی بے خودی ہو گئی۔ اس نے ایک نظر ناگن اور ناگ کو دیکھا جو برف کے ایک تودے کے پیچھے چلے گئے تھے۔ پھر وہ آصف کے ساتھ ایک طرف اوپر جانے کے لیے بڑھتی چلی گئی۔

اور شوکت۔۔۔ وہ ہاپتا کا پتا۔۔۔ رینگتا۔۔۔ چاروں طرف جی برف پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے لگا۔۔۔ ناکام کوشش۔

فضائیں سے دیوتا کی شبیہ غائب ہو گئی۔ ایک زور دار کڑک پیدا ہوئی اور اس نے ناگ اور ناگن کو اپنی لیٹ میں لے لیا۔ ناگ اور ناگن۔۔۔ شامو اور شامی۔۔۔ ایک دوسرے سے پٹ گئے۔ ایک ہو گئے۔۔۔ ایک دوسرے کے منہ پر منہ رکھے۔ لپٹے لپٹے ساکت ہو گئے۔۔۔ جب بجلی کی چمک ختم ہوئی تو وہاں

اور شامی نے انگوٹھی کے کھینچنے کو چاہا لیا۔

”اب تو شامو اور شامی کی اور وہ تیری باتیں اسی طرح سمجھ لیا کریں گے جیسے تم لوگ کچھ دیر پہلے باتیں کر رہے تھے۔“

”دیوتا۔“ وہ چمک گئی۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چمک پڑیں۔

”شامو۔ آگے آ جا۔“

شامو نے شامی کی طرف دیکھا۔ آگے بڑھ کر ایک بار پھر اس کے چہرے، پیشانی، گردن کے کئی بوسے لے ڈالے اور کچھ دور آگے جا کر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ دیوتا کی شبیہ میں ایک بار زبردست چمک پیدا ہوئی اور کڑک بجلی نے شامو کو اپنی لیٹ میں لے لیا۔ وہ جل اٹھا۔ سوکھنے کی طرح۔۔۔ اس کا جسم راکھ ہوئے لگا۔ چند لمحوں بعد وہاں راکھ کا ڈھیر ڈھاقا۔ بجلی نے اسے خاک کر دیا تھا۔ ایک بار پھر بجلی چمکی اور اس نے شامو کی راکھ کو لیٹ میں لے لیا۔ راکھ میں کئی شعلے پیدا ہوئے اور اس سے دھواں نکلنے لگا۔ دھواں اتنا گہرا ہو گیا کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے!

پھر تیسری مرتبہ کڑک پیدا ہوئی اور دھواں چھٹ گیا۔ شامی نے دیکھا۔۔۔ ناگن نے دیکھا کہ شامو کی جگہ ایک ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ اپنا پہن لہرا رہا تھا۔ دیوتا نے ناگن کو پکارا اور وہ تیزی سے رینگتی ہوئی ناگ کے قریب جا کر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔

ایک بار پھر بجلی چمکی اور دونوں اس میں چھپ گئے۔۔۔ جب بجلی کی چمک ختم ہوئی تو ان دونوں کے سروں پر دو سنہرے تاج جھکا رہے تھے۔ دیوتا کے تاج۔۔۔ شوکت۔۔۔ ہاپتا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم اور زبان سے نکلنے والا مواد اب بھی برف کو کندہ کر رہا تھا۔

”میرے بچاویو۔ شوگنا کا بیٹھ تم پر سایہ رہے گا۔“ اور وہ دونوں پھنکار کر رہ گئے۔

ناگ اور ناگن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں مل کر رہ گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے جا رہے تھے۔

پھر ناگ کا چہرہ۔۔۔ ناگن کے چہرے پر جھٹکا چلا گیا۔ ناگن نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی اور ناگ نے اس کے ہونٹوں پر اپنی پہلی مرحمت ثبت کر دی۔ بہت دیر بعد وہ الگ ہوا۔

ناگ یا ناگن کا کوئی وجود نہ تھا۔  
 اسی وقت اوپر سڑک پر کار سارٹ ہونے کی آواز سنائی دی --- پھر انجن کی  
 گھڑ گھڑا ہٹ دور ہوتی چلی گئی۔  
 نیچے برف کے لامحدود فرش پر ایک عجیب الخلق --- کرمہ المنظر، عجوبہ وجود  
 --- رہتا ہوا آگے بڑھنے اور اوپر جانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔  
 یہ شوکت تھا۔  
 مگر نہیں، شوکت نہیں --- یہ شامی کا --- ایک ناگن کا --- ناگ دیوتا کی  
 ایک پجاری شامی کا --- انتقام تھا۔

☆☆☆

## ادھورا قاتل



☆ ..... ایک لڑکی کی قبر پر ہونے والے مسلسل قتل ..... مرنے والی ہر دھینڑہ کی عصمت دری کی جاتی تھی۔  
 ☆ ..... وہ کون درندہ تھا جو قبرستان کے خوفناک ماحول میں یہ شیطانی کھیل کھیلتا تھا؟  
 ☆ ..... ان شیطانی وارداتوں سے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟  
 ☆ ..... ایک اولوالعزم اسپیکر کے غیر متزلزل ارادوں کی داستان جس نے اس ہوس کے پیاسے کو بے نقاب  
 کرنے کی ٹھان لی تھی۔

سرفراز احمد راہی کے قلم سے ایک جادو اثر تحریر جو آخری سطر پڑھے بغیر آپ کو  
 کتاب ہاتھ سے رکھنے نہ دے گی قیمت: 00-100 روپے

فیضان الکیڈمی راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور